نگار پاکستان

جون ۱۹۶۵ء

مدیر اعلیٰ:- نیاز فتحپوری

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

ماجد ولین نمبر

فرانسیسی ادب لطیف کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دلدوز تاریخی رومان جس کی نظیر کسی زبان کے ادب میں آپ کو نظر نہ آئے گی !!

اسے پہاڑوں نے سنا اور کانپ اٹھے

زمین نے سنا اور تھرا اٹھی ★ خدا نے سنا اور تادیر ملول رہا ۔ اُف رے

جسے رُوح سنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کر نئی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے ۔

مُحبّت کا خراج

صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے امنڈتے اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں ۔

اور ممکن نہیں

یہ سانحہ پڑھ کر آپ یہ خراج ادا کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں ۔

قیمت : تین روپے ۳

نگار پاکستان ★ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ★ کراچی ۳

نورُ الہدیٰ مدنی قرآن مجید معرّیٰ عکسی

یوں تو بے شمار قرآن مجید اب تک طبع ہو چکے ہیں لیکن ہم نے نورُ الہدیٰ قرآن مجید میں آٹھ صفحات کا رنگین ضروری ضمیمہ شامل کیا ہے جس میں بیشمار مفید معلومات مثلاً آدابِ تلاوت، رموزِ اوقاف، تجوید قراۃ، قرآن کی بعض سورتوں کے نقش، فالنامہ واعمالِ قرآنی کا مزید اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے اسکی اہمیت بیحد بڑھ گئی ہے اور دیگر مطابع کے قرآن مجید سے بیحد نمایاں وممتاز ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر خصوصیات درج ذیل ہیں:— (۱) اغلاط سے پاک (۲) ہر اعراب اپنے صحیح مقام پر (۳) علامہ سجاوندیؒ کے رموزِ اوقاف کے مطابق (۴) ہر سطر کے درمیان میں لائن، ہر حرف جدا واضح اور غیر مبہم جس سے پڑھنے والے کو بیحد سہولت ہوتی ہے۔ آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے (۵) کتابت بیحد صاف، خوشخط اور جلی (۶) طباعت کی رنگینیوں سے آراستہ (۷) ہر صفحہ پر خوشنما بیل (۸) ٹائٹل دیدہ زیب سہ رنگہ آرٹ پیپر، (۹) جلد مضبوط بائنڈنگ کلاتھ، سائز ۲۰×۳۰ ضخامت ۸۰۴ صفحات۔

اِن تمام خوبیوں کے باوجود ہدیہ اس قدر کم اور رعایتی ہے کہ ہر معمولی حیثیت کا آدمی بہ سہولت خرید سکے۔

ہدیہ قسم اوّل گلیز کاغذ مجلّد آٹھ روپے پچاس پیسے
ہدیہ قسم دوم رنگین کاغذ مجلّد آٹھ روپے ؞
ہدیہ قسم سوم میکانیکل کاغذ مجلّد سات روپے پچاس پیسے
سیٹ علیحدہ علیحدہ سپارے مجلّد کامل اٹھارہ روپے

سیٹ علیحدہ علیحدہ سپارے رنگین ٹائٹل والے نو روپے

آدابِ تلاوتِ قرآن
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

تلاوتِ قرآن مجید ہر مسلمان پر فرض ہے اور سب کرتے ہیں لیکن آدابِ تلاوت کا لحاظ رکھے بغیر تلاوت کرنے سے جو گناہ ہوتا ہے وہ تحریر نہیں کیا جا سکتا، اسی ضرورت کے پیشِ نظر حضرت مفتی صاحب نے اِس نازک مسئلے کو انتہائی محنت سے مستند و محققانہ انداز میں سپردِ قلم کیا ہے جس سے واقف ہونا ہر مسلمان کا ایمانی فریضہ ہے تاکہ تلاوت کے ثواب سے کماحقّہٗ استفادہ کیا جا سکے۔ کتابت و طباعت خوشخط و معیاری ہے ؞ ؞
کاغذ عمدہ گلیز مجلّد مع حسین گرد پوش، قیمت دو روپے پچاس پیسے ؞

رہنمائے دین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

فضائل حج

حج دینِ اسلام کا ایک رُکن ہے اسکی فضیلتیں کیا ہیں؟ قرآن کریم نے اس بارے میں کیا ارشاد کیا ہے اور احادیثِ نبوی سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ فضائل حج میں حضرت علامہ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث نے انتہائی مستند و محققانہ انداز میں تحریر فرمائے ہیں، اس کا مطالعہ عازمین حج کیلئے خصوصاً و عام مسلمانوں کیلئے عموماً بیحد ضروری ہے۔ کاغذ گلیز عمدہ، سائز $\frac{20\times30}{16}$ ضخامت ۴۴ صفحے کتابت وطباعت عمدہ و معیاری، دو رنگہ حسین سرورق ۔

(قیمت چار روپے)

اطیب البیان (ردِ) تقویۃ الایمان

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی کتاب تقویۃ الایمان جو درحقیقت عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا چربہ ہے، اسکی پیدا کردہ ضلالت کو مسلمانوں سے دُور کرنیکے لئے حضرت مولانا محمد نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے اسکی اہمیت پڑھنے سے ظاہر ہوگی ہر مسلمان کیلئے اسکا مطالعہ بیحد ضروری ہے، کتابت و طباعت انتہائی خوشخط و معیاری ہے۔ کاغذ عمدہ گلیز دو رنگہ حسین سرورق، سائز $\frac{20\times30}{16}$ ضخامت ۴۰۰ صفحات، قیمت چار روپے

مضامین

عالمِ بے بدل حضرت مولانا محمد نعیم الدین صاحب مُرادآبادی اپنی اس بینظیر تصنیف میں اسلام کو زندہ کرنے والا حق و باطل کا وہ عظیم معرکہ جو پوری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے جسکو دیکھکر کائنات لرزگئی، جسکو پڑھکر آج بھی دل لرز جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں انتہائی مستند و محققانہ انداز میں بحث فرمائی ہے، قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ کتابت و طباعت خوشخط و معیاری، سائز $\frac{20\times30}{16}$ ضخامت ۴۴ صفحات، سہ رنگہ حسین سرورق، قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ۔

رہنمائے دین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۴۷۲

ٹیلیفون نمبر ۴۳۶۹۳

جون ۱۹۶۵ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتحپوری

نائب مدیران

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

عارف نیازی

زر سالانہ دس روپے …… * …… قیمت فی پرچہ پچھتّر پیسے

صدر دفتر:- نیاز منزل - ناظم آباد - کراچی ۱۸

شاخ ۲/۳ بی - گارڈن مارکیٹ - کراچی نمبر ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/ ایف یو پی ۳۶۶۹ - ۶۲/۱۸ - محکمہ تعلیم کراچی

… نے مشہور آفسٹ پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگیا

فہرست مضامین

۴۴واں سال	جون ۱۹۶۵ء	شمارہ ۶

ملاحظات ـــــــ نیاز فتحپوری

اہل قلم اور اہل تحقیق حضرات کی خدمت میں چند معروضات ـــــــ آغا افتخار حسین

ادب کیا ہے؟ ـــــــ وقار احمد رضوی

صادق القادری ـــــــ نظیر صدیقی

ترکی ادب کا پس منظر ـــــــ ڈاکٹر محمد صابر

لکھنؤ میں اردو ـــــــ سید محمد باقر شمس لکھنوی

جلال الدین خلجی اور سیدی مولا کا قتل ـــــــ نیاز فتحپوری

مثنوی قطب مشتری اور ملا وجہی کی کردار نگاری ـــــــ نسیم اختر پالوی

اردو یا پاکستانی ـــــــ پروفیسر خان رشید

اقبال کے بعض نظریات ـــــــ احمد رفاعی

باب المراسلہ ـــــــ نیاز فتحپوری
۱ ۔ اسلامی قوانین ۔ سید علی مقصود صاحب
۲ ۔ دالبشلم کے نام ایک خط

باب الاستفسار ـــــــ نیاز فتحپوری
۱ ۔ امیر خسرو اور ہندی اردو الفاظ
۲ ۔ بخاری و مسلم
۳ ۔ غالب کے ایک شعر کا عروضی وزن
۴ ۔ زیب النساء اور عاقل خاں

منظومات ـــــــ
محبوب الرحمان دانش عظیم آبادی ۔ اس ۔ ام ۔ دی ۔ کراچی
آثر لکھنوی ۔ دل شاہ جہاں پوری

نگار پاکستان کا سالنامہ ۱۹۶۵ء (جولائی اگست کا مشترکہ شمارہ)

جدید شاعری نمبر

۱۵ر جولائی ۱۹۶۵ء کو شائع کیا جا رہا ہے

جس میں جدید شاعری کے آغاز، ارتقاء، اسلوب، فن اور موضوعات کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس انداز سے کہ یہ بحث آپ کو حالی و اقبال سے لے کر دور حاضر تک کی شعری تخلیقات و تحریکات کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔

اسکے چند عنوانات

جدید شاعری کے اولین محرکات۔ جدید شاعری کی ارتقائی منزلیں۔ جدید شاعری کی داخلی و خارجی خصوصیات جدید شاعری اور اس کے اصناف۔ جدید شاعری میں ابہام و اشاریت کا مسئلہ۔ جدید شاعری میں کلاسیکل عناصر جدید شاعری کی تحریکات۔ جدید شاعری کی مقبولیت و عدم مقبولیت کے اسباب۔ نظم آزاد، نظم معری۔ سانٹ اور جدید غزل کی خصوصیات۔ جدید شاعری کے نمایاں موضوعات و رجحانات۔ جدید شاعری کا سرمایہ اور اس کی ادبی قدر و قیمت وغیرہ۔

اردو کے تقریباً سارے ممتاز اہل قلم اس نمبر میں حصہ لے رہے ہیں

(خریداران نگار کو یہ نمبر مفت پیش کیا جائے گا)

ادارہ

(خریدارانِ نگار صفحہ ۶۰ کا اعلان ضرور ملاحظہ فرمائیں)

ملاحظات

(نیاز فتحپوری)

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر علی یاور جنگ کا یونیورسٹی کے ہنگامہ میں مجروح ہو جانا یقیناً افسوس ناک امر ہے۔ لیکن اس سے جو نتائج پیدا ہوتے نظر آتے ہیں وہ غالباً اس سے زیادہ افسوس ناک ثابت ہوں گے۔ اس وقت تک پریس، ارباب حکومت اور مبصرین سیاست کے مختلف بیانات اس حادثہ کے متعلق شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کے حقیقی اسباب کا تجزیہ اس وقت تک کسی نے نہیں کیا۔

حادثہ کے دو پہلو تو بالکل واضح ہیں جن سے انکار ممکن نہیں یعنی ایک علی یاور جنگ کا مضروب ہو جانا اور دوسرا طلبہ کا ہنگامہ خواہ اس کی حیثیت ابتدا ہی سے جارحانہ رہی ہو یا پولس کی آمد اور بعض طلبہ کے زخمی ہو جانے کے بعد اس نے تشدّد کی صورت اختیار کر لی ہو۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا، اور اس ہنگامہ کا محرک اصلی کیا تھا۔ سو اس کے متعلق کسی قیاس آرائی کی ضرورت نہیں کیونکہ خود علی یاور جنگ کے بیان سے اس کی تعیین ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے انجینیرنگ کالج کے داخلہ کے لئے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کا اوسط ۷۵ سے ۵۰ فی صدی کر دیا تھا، تاکہ صرف اچھے اور معیاری قابلیت کے ذہین طلبہ کو انجنیری کی تعلیم کا موقعہ دیا جائے اور محض ۷۵ فی صد اوسط پورا کرنے کے لئے یونیورسٹی کے نااہل طلباء کو نہ لینا پڑے۔ اصولی حیثیت سے اس رائے کی اصابت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن عملی حیثیت سے یقیناً یہ رائے مصلحت و تدبر کے خلاف تھی۔

مسلم یونیورسٹی کے قیام کا اصل تصوّر یہ تھا کہ یہاں مسلم طلباء کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا جائے اور ساتھ ہی ایک مخصوص ذہنیت و ثقافت بھی ان میں پیدا کی جائے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کے زمانے سے ۱۹۴۷ء تک کسی نہ کسی حد تک اس کو برقرار بھی رکھا گیا لیکن تقسیم ہند کے بعد جب لفظ مسلم کی نسبت اس یونیورسٹی کے نام کے ساتھ SECULARISM کے منافی نظر آئی تو اس کا رد عمل یہ ہوا کہ معلمین و متعلمین کی حد تک مسلم و غیر مسلم کی قید دور کر دی گئی اور آہستہ آہستہ یہاں ہندو طلبہ و اساتذہ کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ حالانکہ ہندو یونیورسٹی بنارس کو اس رواداری برتنے پر مجبور نہیں کیا گیا اور وہاں کی فضا بدستور SECULAR رہی اور اب بھی ہے — لیکن خیر یہ بات شکایت کی نہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد یہاں کی دیرینہ روایات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان کی نوعیت کیا تھی۔

سب سے پہلا تغیّر تو یہ ہوا کہ ہندو طلبہ کے داخلہ سے، یہاں کے [illegible] کی ہیئت اجتماعی پر خاصہ اثر پڑا اور وہ یکرنگی و یکسانی جو یہاں کی فضا میں پہلے پائی جاتی تھی کم ہونے لگی۔ دوسرا تغیر یہ ہوا کہ غیر مسلم اساتذہ کے شمول کی بنا پر تعلیمی فضا میں بھی کچھ بیگانگی سی محسوس کی جانے لگی جس سے طلبہ کا متاثر ہونا بھی ضروری تھا اور اس طرح ایک نیم سیاسی رجحان تنافس و تناقض کا

یہ میں پیدا ہونے لگا جو تعلیم کے اصل مقصد سے انھیں دور تر کر دینے والا تھا اور آخر کار رفتہ رفتہ یہاں کی فضا تعلیمی حیثیت سے تی خراب ہوگئی کہ طلبہ کا مقصود صرف ڈگری حاصل کر لینا رہ گیا۔ اول تو تقسیم ہند کے بعد بھارت کی تمام درسگاہوں کا معیار تعلیم گھٹتا چلا جا رہا تھا اور ہر یونیورسٹی ایک نیم سیاسی ادارہ بنتی چلی جا رہی تھی، جہاں سوال تعلیم و تعلم کا نہ تھا بلکہ محض ذاتی تحفظ اور زیادہ سے زیادہ مالی فایدہ حاصل کرنے کا اور اس کا اثر علی گڑھ یونیورسٹی پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ پڑا اور بری طرح پڑا۔

ہر چند کہ اکابر مسلم یونیورسٹی کے ذہنی انحطاط کا آغاز تقسیم ہند سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ لیکن ملک کے حصول آزادی کے بعد اس کی رفتار تیز تر ہوگئی، یہاں تک کہ پڑھنا پڑھانا تو ثانوی چیز ہو کر رہ گیا اور پارٹی بندیاں، جوڑ توڑ، کاٹ پھانس، اصل مقصود جس میں یہاں کے اساتذہ اور طلبہ دونوں برابر تھے اساتذہ کی کوشش یہ رہتی تھی کہ وائس چانسلر کا تقرب حاصل کر کے جتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اٹھا لیا جائے اور طلبہ اس پارٹی کے پروپاگنڈا کے آلۂ کار بن جاتے تھے جس کی مدد سے وہ بغیر پڑھے لکھے آسانی سے ڈپلوما حاصل کر سکیں اور بدقسمتی سے کسی وائس چانسلر نے ان مخصوص حالات کی طرف توجہ نہیں کی اور صرف ظاہری نمود و نمائش کو اپنے سامنے رکھا، ہاں یہ تو ضرور ہوا کہ یونیورسٹی کی حدود میں نئی نئی عمارتیں بہت سی بن گئیں۔ انجنیری و طب کے کالج بھی تعمیر ہو گئے، علوم و فنون کے اختصاصی تعلیم کے لئے بھی کچھ نئے شعبے وجود میں آ گئے لیکن جس حد تک صحیح تعلیم اور اکاڈمک فضا قائم کرنے کا تعلق تھا۔ اسے سب نے نظر انداز کر دیا اور اگر کسی وائس چانسلر نے اس کی کوشش کی بھی تو اسے آخر کار مایوس ہو کر اس منصب سے دست بردار ہونا پڑا۔

بہر حال جب علی یاور جنگ وائس چانسلر ہو کر یہاں آئے تو مسلم یونیورسٹی اسی انحطاطی دور سے گزر رہی تھی اور تعلیمی سرگرمیوں کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے انھیں یہاں کی تعلیمی پستی ہی دور کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو، لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو طریق کار انھوں نے اختیار کیا وہ صحیح نہ تھا۔

یہاں کا اہم ترین کالج انجنیرنگ کالج ہے۔ کیونکہ یہاں کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد کسب معاش کے وسیع ذرائع حاصل ہو جاتے ہیں اور یہاں کے طلبہ نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ اس کالج سے فائدہ اٹھانے کا حق انھیں زیادہ حاصل ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کی امداد کی بنا پر یہ کالج صرف مسلم طلبہ کے لئے مخصوص نہیں رہ سکتا تھا اس لئے دوسرے کالجوں کے غیر مسلم طلبہ بھی یہاں تعلیم پانے لگے اور اساتذہ کی جماعت میں بھی اچھا خاصہ غیر مسلم عنصر شامل ہو گیا۔ تاہم علی یاور جنگ کی آمد سے قبل مسلم طلبہ کے لئے ۷۵ فیصد کا تناسب قائم ہو چکا تھا اور یہ بسا غنیمت تھا۔ لیکن علی یاور جنگ نے اس تناسب کو ۵۰ تک گھٹا دینے کا ارادہ ظاہر کر کے مسلم طلبہ میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نیت نیک ہو اور وہ یہ چاہتے ہوں کہ صرف وہی مسلم طلبہ انجنیرنگ کالج میں داخل کئے جائیں جو واقعی اس کے اہل ہیں اور محض مسلمان ہونا کافی نہ سمجھا جائے لیکن انھوں نے اس اصلاح کا نفاذ کرنا چاہا بالکل غلط طریقہ ہے اگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ یونیورسٹی کے وہ طلبہ جو انجنیرنگ کالج کے امتحان داخلہ میں شریک ہوتے ہیں زیادہ تر نالائق ہوتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں یہ معلوم کرنا چاہئے تھا کہ اس کا اصل سبب کیا ہے۔ یقیناً اس کا سبب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ نظام تعلیم یونیورسٹی کا خراب ہے۔ اور یہاں کے اساتذہ اپنے فرائض اچھی طرح انجام نہیں دیتے۔ بنا بریں علی یاور جنگ کو سب سے پہلے اس بنیادی خرابی کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تھا نہ یہ کہ طلبہ کی نااہلی کا ذمہ دار صرف انھیں کو قرار دیا جائے اور تعزیراً ان کے حقوق کو بھی چھین لیا جائے۔ بہر حال علی یاور جنگ کی یہ

اصولی غلطی تھی کہ انھوں نے طلبہ کے تناسب داخلہ کو تو آمرانہ انداز سے ۲۵ فی صد کم کر دیا ۔ لیکن اساتذہ کو بالکل غیر ذمہ دار قرار دے کر ان سے کوئی باز پرس نہیں کی ۔

بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو گیا ۔ علی یاور جنگ واپس آئیں یا نہ آئیں ، لیکن مسلم یونیورسٹی بیشک ایک بڑے خطرہ سے دوچار ہو گئی ، کیونکہ اب حکومت ہند کو مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں براہ راست دخل دینے کا بھی بہانہ ہاتھ آگیا اور چونکہ اس وقت مسٹر محمد علی چھاگلا مرکزی وزیر تعلیم ہیں ۔ جن کو اسلام سے اتنی نسبت بھی نہیں جتنی بتوں کو کعبہ سے ہے ۔ اس لئے اگر مسلم یونیورسٹی کے موجودہ نظام کو بدل کر بالکل SECULAR کر دیا گیا جو جناب چھاگلا کی منطق میں صرف ANTI MUSLIM کا دوسرا نام ہے تو جائے تعجب نہیں ۔ چھاگلا صاحب پہلے ہی فرما چکے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کو لفظ مسلم سے منسوب کرنا ان پر بہت شاق گزرتا ہے اور اس نسبت کو دور کر کے انھیں بڑی خوشی حاصل ہوگی ۔

اس مسئلہ پر لکھنؤ کے ایک مشہور و مقتدر کانگریسی روزنامے نے جو اداریہ لکھا ہے اس کا اقتباس بھی ملاحظہ ہو ۔ لکھتا ہے :-

" اقلیتوں کی ترقی کے لئے سکولر حکومت کو کوئی خاص بندوبست کرنا چاہیے یا نہ کرنا چاہیے ۔ یعنی اس بات کی دیکھ بھال ہونا چاہیے کہ اقلیتوں کو سرکاری ملازمتوں میں مناسب جگہیں مل رہی ہیں یا نہیں کہیں تعلیم میں وہ پچھڑ تو نہیں رہی ہیں کہیں وہ احساس کمتری کا شکار تو نہیں ہو رہی ہیں یا نہ ہونا چاہیے ۔ جب سے ہندوستان کو آزادی ملی ہے یہ سوال طرح طرح کے روپ میں ملک کے سامنے آرہا ہے ۔ اب اس کا تازہ روپ ہے مسلم یونیورسٹی کے بارے میں ۔ اس سوال کا اٹھنا یعنی یہ کہ یہ یونی ورسٹی مسلمانوں کی یونیورسٹی رہے یا اس کو اور یونیورسٹیوں کی طرح بنا دیا جائے کہ وہ سب کے لئے ہو جائے ۔

مسلم یونیورسٹی کے بارے میں کبھی یہ سوال کئی مرتبہ اٹھ چکا ہے ۔ ایک گروہ تو اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس یونیورسٹی میں جتنی ایسی باتیں ہیں جو اس کو مسلمانوں سے وابستہ کرتی ہیں سب کو چن چن کر ختم کر دیا جائے ۔ نہ تو اس کے نام میں مسلم رہے نہ داخلے میں کوئی پابندی رہے اور مسلمانوں کی ترقی پر یہاں کوئی خاص زور دیا جائے ۔ ان لوگوں کے خیال میں ایسی کوئی بات کرنا قوم پروری اور سکولرزم کے خلاف ہے ۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ مسلمان ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اس لئے ان کے اطمینان اور ان کی ترقی کے لئے مسلم یونی ورسٹی کو اسی شان سے باقی رہنا ضروری ہے جس شان سے وہ چلی آرہی ہے ۔

اب آیئے اس سوال پر کہ سکولر حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اقلیتوں کے تحفظ اور ترقی کی خاص کوشش کرے یا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے تمام تحفظات کو ختم کر کے اقلیت کو اس کے حال پر چھوڑ دے ؟ ان دونوں میں سے کون سی چیز ملک اور قوم کے لئے مفید ہوگی ۔ ہم سوال کے آخری ٹکڑے پر خاص طور سے زور دیں گے ۔ کیونکہ سکولر حکومت جو بھی فیصلہ کرے گی وہ کل قوم کے فائدے اور نقصان کو دیکھ کر کرے گی ۔

دنیا بھر میں جمہوری حکومتوں میں اقلیتوں کے ساتھ خاص سلوک کیا جاتا ہے ۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ ایسے سلوک کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے جسم کے کسی عضو میں چوٹ یا زخم ہو تو اس کا اثر پورے

ہے۔ اور اگر بہت دنوں تک اس زخم کی خبر نہیں لی جاتی ہے تو وہ کینسر بن جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت ملک کی زندگی کی بھی ہے۔ یہاں بھی اگر کوئی گروہ پستی میں پڑا رہے گا تو پوری قوم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

یوں تو پورا جنوبی ہند ہندی کے خلاف ہے، لیکن اس کے اصل لیڈر ہیں تامل ناڈ والے جو بہت چھوٹی اقلیت ہے۔ کیا اتنی سی اقلیت کو طاقت سے دبایا نہیں جاسکتا ہے؟ ضرور دبایا جا سکتا تھا، لیکن اگر ایسا کیا جاتا تو کیا ملک ترقی کر سکتا تھا؟۔

دراصل ہر اکثریت کے اندر اقلیتیں ہوتی ہیں۔ اور ذرا سے اختلاف یا خوف پر وہ ابھر آتی ہیں، جنوبی ہند والے بھی ہندو ہیں اور شمالی ہند والے بھی ہندو ہیں۔ اگر ہندوؤں کو ہندوستان کی اکثریت قرار دیا جائے تو دونوں جگہ کے ہندو اس اکثریت کا جزو ہیں لیکن لسانی اختلافات پر یہ اکثریت دو حصوں میں بٹ گئی۔ اور جو حصہ چھوٹا تھا وہ اپنے کو اقلیت ہی محسوس کرنے لگا۔ اکثریت کا اس طرح دو حصوں میں بٹ جانا ہر وقت ممکن ہے اور اس کے لئے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں اس لئے کسی اکثریت کو مستقل اکثریت نہ سمجھنا چاہیئے۔ اب اگر اقلیت کو دبایا جائے گا تو اکثریت ہی کے بہت سے اجزا خوف زدہ ہو جائیں گے اور اپنے دفاع کے لئے اقدام کرنے لگیں گے، اس طرح اکثریت ٹوٹنے لگے گی۔

جو لوگ اقلیتوں کے ساتھ رعایت کرنے کے خلاف ہیں وہ دراصل اکثریت کی بناوٹ کو نہیں دیکھتے ہیں۔ اور نہ اس نفسیاتی اثر کو پیش نظر رکھتے ہیں جو اس وقت پیدا ہو گا جب اقلیتوں کو دبایا جائے گا۔

عاشورۂ محرم میں سُرخ ہو جانے والے تسبیح کے دانے

یہاں ایک میرے کرم فرما ہیں سید وارث حسین صاحب، جن کا اصل وطن مارہرہ (ایٹہ) ہے لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی آ گئے اور انھوں نے یہیں مستقلاً قیام کر لیا۔ ان کے پاس ایک تسبیح کے دو دانے ہیں جو یقیناً مٹی کے بنے ہوئے خاکستری رنگ کے ہیں لیکن ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ۹ محرم سے ۱۰ محرم کی شام تک رنگ بدل کر کافی سُرخی مائل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد پھر اپنا اصلی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے عوام و خواص کو اس کا مشاہدہ کرایا تھا لیکن میں بھی نظارہ ... میں بیشک نہ دیکھ سکا تھا۔ لیکن سال رواں کے عاشورہ محرم میں میں نے بھی ان دانوں کو دیکھا اور بیّن طور پر کئی سُرخ دھبے میں نے ان میں دیکھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ تسبیح جناب امام جعفر صادق کی ہے جس کے ۳۶ دانے کسی صورت سے سادات مارہرہ کے خاندان میں منتقل ہوئے اور انھیں میں سے دو دانے وارث حسین صاحب نے حاصل کئے کیونکہ ان کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔

یقیناً یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں اور بظاہر کوئی عقلی توجیہ اس کی نہیں ہو سکتی، لیکن ہے بہر حال یہ بات بالکل صحیح اور جب تک ... تجزیہ کر کے اصل حقیقت کا پتہ نہ چلایا جائے مجبوراً ہم کو اپنی آنکھوں پر اعتماد کرنا پڑے گا خواہ عقل باور کرے یا نہ کرے۔

اہلِ قلم اور اہلِ تحقیق حضرات کی خدمت میں چند معروضات

(آغا افتخار حسین)

اردو زبان تین صدیوں سے زیادہ عرصہ سے اس برصغیر کی ثقافتی زبان ہے اور اس عرصہ میں اردو نے بولی، زبان اور ادب کی تینوں ارتقائی منازل طے کر لی ہیں ۔ بیسویں صدی عیسوی میں اردو اس منزل میں داخل ہوئی جو کسی قوم کے ثقافتی مظاہر کی اعلیٰ اور اہم ترین منزل ہوتی ہے ۔ یعنی تحقیق کی منزل ۔ اِس صدی کی ابتدا میں اردو زبان کے اہلِ قلم میں تحقیق کا اعلیٰ شعور پیدا ہوا ۔ تذکرہ نویسی کی جگہ تاریخ نویسی نے لی ۔ پھر گزشتہ بیس پچیس سال میں ادیبوں نے ادب کا جائزہ لینے کے لئے محض انفرادی اظہار کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے لئے حتی الوسع کچھ معیار اور ضوابط معیّن کرنے کی کوشش کی اور اس طرح تنقید اور اصولِ تنقید کے مسائل پر بہت کچھ لکھا گیا ۔ اس کے بعد خصوصاً آزادی کے چند سال بعد صحیح معنوں میں یونیورسٹیوں میں تحقیق کی ابتدا ہوئی ۔ منظم تحقیقی کام جنگ سے پہلے یورپ کی بعض یونیورسٹیوں میں کیا گیا ۔ اور برصغیر کی بعض یونیورسٹیوں میں بھی چند گراں قدر مقالے لکھے گئے ۔ لیکن برصغیر کی یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام تیزی کے ساتھ آزادی کے بعد ہی شروع ہوا اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ۔ بعض لوگوں کی رائے میں ان میں سے بعض مقالے تحقیق کے اس معیار پر پورے نہیں اُترتے جس کی توقع عالمی ادب کے اس دور کے محققین سے کی جا سکتی ہے لیکن ایسے مقالے بھی لکھے گئے ہیں جن میں تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے اور ان کے مصنفین نے بین الاقوامی معیار کے مطابق " افقِ علم کو وسیع کیا ہے "۔ یہ سب ہمارے اہل قلم اور اہل تحقیق کا فیضان ہے جس کے لئے اُردو زبان و ادب کا ہر طالب علم ان حضرات کا ممنون ہے۔

اب جبکہ اردو زبان تحقیق کی منزل میں داخل ہو چکی ہے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کا معیار قائم کیا جائے ۔ علمی دیانت کے کچھ اصول وضع کئے جائیں اور تحقیق کی صحیح روایات برقرار رکھی جائیں ۔ اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ زبان کے طالب علموں کی مشکلات بھی اہل تحقیق کے پیش نظر رہا کریں اور وہ کبھی کبھی خوگر حمد سے تھوڑا سا گِلہ بھی سُن لیا کریں ۔ اس مضمون میں ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے کچھ اسی قسم کی جسارت کروں گا ۔

حقیقت اور رائے

تحقیق حقیقت کی جستجو ہے ۔ اور چونکہ حقیقت اکثر نہاں اور گریزاں رہتی ہے ۔ اس لئے اسے پانے کے لئے جستجو کرنا پڑتی ہے ۔ محقق کا سب سے اہم فرض اس حقیقت کی تسخیر اور نقاب کشائی ہے ۔ حقائق پر اظہار رائے محقق کا حق اور حصہ ہے لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ حقائق صحیح ہوں ۔ بعض تحقیقی مقالوں میں دیکھا گیا ہے کہ حقائق کی تلاش و بیان کے مقابلے میں اظہار رائے پر زیادہ زورِ قلم صرف کیا جاتا ہے ۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے ۔ آپ کو رائے کا اظہار نہایت خوبصورت اور پرشکوہ الفاظ میں ملے گا ۔ لیکن حقائق کی دریافت اور تحلیل و تجزیے میں نہایت سطحی قسم کی تحریریں ملیں گی ۔ ادبی تحقیق کے لئے بنیادی حقیقتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کو سب سے پہلے تحقیق کا موضوع بنانا چاہئے

…متن ہی کو لے لیجئے۔ کتنے تحقیقی مقالے ایسے لکھے گئے ہیں جن میں شعرا (اور خصوصاً قدیم شعرا) کے کلام کے صحیح متن کے …متن کے بارے میں بحث کی گئی ہے؟ شعرا کے کلام کے مجموعے بار بار چھپتے ہیں لیکن ان کا متن دوسرے سے نہیں ملتا۔ بعض اہلِ تحقیق …شعرا کے کلام کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے لیکن اس میں کتابت کی بیشمار غلطیاں ہیں۔ متن ادب کی اساس اور بنیادی حقیقت ہے۔ اگر یہی …صحیح نہیں تو آپ تنقید و تبصرے پر ہزاروں صفحے تحریر فرما دیجئے۔ تحقیق کے معیار کے لحاظ سے اس کام کی زیادہ اہمیت نہیں۔

کیا نقادِ کرام کسی شاعر کے کلام پر تنقید اور اظہار رائے سے پہلے اس کے متن کے صحیح تعین اور طباعت کی طرف زیادہ …توجہ فرمانے کی زحمت کریں گے؟[1]

…حوالے کی غلطیاں

حوالہ تحقیق کی جان ہے۔ جب کاوش و تلاش کے بعد محقق حقیقت تک پہونچتا ہے تو اس کا حوالہ دیتا ہے اور اس حوالہ کی صحت پر اس کی قدر و قیمت کا بڑی حد تک دار و مدار ہوتا ہے۔ میں نے یورپ میں …محققین سے سنا کہ انھیں کسی تحقیقی مقالے کی اہمیت کا اندازہ اکثر اس کے فٹ نوٹ دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ادبی …مقالہ نگاروں میں حوالہ اور فٹ نوٹ تحریر کرنے کی روایت نسبتاً زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے …حوالے کی غلطیاں جو عام طور پر نظر سے گذرتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

بعض مقالوں اور کتابوں میں سرے سے حوالہ ملتا ہی نہیں۔ پیرس میں قیام کے دوران میں مجھے ایک یورپی زبان کے …ادب کی تاریخ کی کتاب ملی جو اردو میں لکھی ہوئی تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی خصوصاً اس لئے کہ کتاب برصغیر ہند و پاکستان …کے ایک مشہور دانشور نے لکھی تھی جن کے تبحرِ علمی کا میں ہمیشہ سے مداح ہوں۔ میں نے کتاب شروع سے آخر تک پڑھی لیکن …مجھے ایک حوالہ بھی نہیں ملا۔ کتابیات بھی نہیں لکھا گیا تھا جس سے اندازہ ہو سکے کہ تصنیف کے وقت کون کون سی کتابیں مصنف …کی نظر سے گزریں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس ادب کی اس تاریخ کا تمام تر ماخذ مصنف کا ذہن تھا؟ اگر دیگر مصنفین کی

---

[1] شعرا کے مطبوعہ کلام میں کتابت کی غلطیوں اور صحیح متن کا تعین نہ کئے جانے سے ہمارے ادب کی تدریس میں کیا دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس لاپرواہی سے ہمارے ادب کا معیار کس طرح متاثر ہو رہا ہے اس کے بارے میں میرے عزیز دوست رالف رسل صاحب ریڈر اردو لندن یونیورسٹی نے ایک خط میں بحث کی ہے کہ جو موصوف نے مجھے لکھا تھا اور جس کا ترجمہ اردو نامہ اکتوبر تا دسمبر سنہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

غلط متن کیا کیا گل کھلا سکتا ہے اس کی دلچسپ مثال حال میں میری نظر سے گذری۔ فاران کراچی کے اپریل سنہ … کے شمارے میں اشفاق علی خاں صاحب کی "جگر کی غزلیہ شاعری" پر ایک تسکین قریشی صاحب کا ایک طویل تبصرہ شائع ہوا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں جگر کی شاعری کے نقائص بیان کئے گئے ہیں۔ اور مصنف نے مثالیں دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جگر ناموزوں شعر کہتے تھے۔ تسکین قریشی صاحب نے اپنے تبصرہ میں لکھا ہے کہ جن اشعار کو اشفاق علی خاں صاحب نے ناموزوں قرار دیا ہے وہ دراصل "شعلۂ طور" کے ناقص ایڈیشن سے لئے گئے ہیں۔ ان اشعار کا جب "شعلۂ طور" کے پہلے ایڈیشن سنہ ۱۹۳۳ء (مکتبہ جامعہ دہلی) اور سنہ ۱۹۵۰ء کے ایڈیشن (ادارۂ فروغ اردو لاہور) سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جگر کے یہ اشعار سہوِ کتابت سے کیا سے کیا ہو گئے اور ان کی "ناموزونیت" پر اشفاق صاحب نے … صفحے کی کتاب لکھ ڈالی۔

ع خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے!!

قارئین … سے درخواست ہے کہ رالف رسل صاحب کا خط اور تسکین قریشی صاحب کا یہ مضمون ملاحظہ فرما کر عبرت حاصل کریں۔

کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا۔ (جیسا کہ دیباچے میں اعتراف کیا گیا ہے) تو کم از کم ان کتابوں کا ذکر کر دینے میں کیا مضائقہ اسی طرح ابھی حال ہی میں یورپ کے فلاسفہ پر ایک کتاب میری نظر سے گزری جس میں کسی کتاب اور کسی ماخذ کا حوالہ دیا گیا تھا۔ یہ طریق تصنیف تحقیق کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔

دوسرے قسم کی غلطی جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ کہ مصنفین حوالہ تو دیتے ہیں لیکن اس معاملہ میں زیا راست بازی سے کام نہیں لیتے۔ مثلاً یہ کہ حوالے کے اصل ماخذ تک پہنچنے کی زحمت نہیں کرتے اور کسی دوسرے مصنف دئے ہوئے حوالے کو نہایت اطمینان سے نقل کر دیتے ہیں۔ اس سہل انگاری سے دو نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اصل ما تک رسائی حاصل کئے بغیر اس کا حوالہ دینا علمی دیانت کے منافی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر سوئے اتفاق سے (اور یہ سو اتفاق اکثر دیکھنے میں آتا ہے) اس ماخذ کا حوالہ دیتے وقت ایک مصنف سے غلطی ہوگئی تو یہی غلطی حوالے کے ناقل مصنف صاحب سے بھی خود بخود سرزد ہو جاتی ہے کیونکہ انھوں نے تو نقل کی ہے۔ اصل تک تو پہنچے ہی نہیں۔ اور اس طرح غلط نقل کی نقل ہوتی چلی جاتی ہے۔

بعض صورتوں میں یہ ممکن ہے کہ محقق کی رسائی اصل ماخذ تک نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے محقق اس کتاب کا حوالہ دیدے جہاں سے اس نے حوالہ نقل کیا ہے۔ اور اس کا اعتراف کرے کہ اصل ماخذ اس کی دسترس باہر تھا۔ اس اعتراف سے علمی دنیا میں اس کی دیانت اور راست بازی کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

تیسری دشواری حوالوں میں یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ حوالے غلط یا تشنہ ہوتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حو واوین میں دیا جائے۔ اور ماخذ کو مکمل طور پر ظاہر کیا جائے۔ بعض جگہ کتاب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ مصنف کا نام نہیں جاتا اور اگر یہ دونوں نام دیئے جاتے ہیں تو کتاب کے صفحہ کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ بہتر صورت یہ ہے کہ حوالہ میں مصنف کے نا کتاب کے نام۔ اور صفحہ کے حوالے کے ساتھ کتاب کے ایڈیشن مطبع۔ اور جائے اشاعت کا نام بھی حوالے میں دیا جائے اہل تحقیق کو کتاب کی تلاش میں مدد ملے۔ لہ

اور چوتھی قابل اعتراض جسارت وہ "دلیر" مصنفین کرتے ہیں جو کسی کتاب یا مضمون سے دل بھر کے استفادہ ک ہیں اور اسکا حوالہ دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ان حضرات کے لئے سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا انھیں نیک

دیگر زبانوں سے تراجم

تحقیق میں تراجم کی بڑی اہمیت ہے۔ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں ہے جس دوسری زبانوں کے تراجم سے اپنے ادب کو فروغ نہیں دیا ہو۔ ہماری زبان میں ترجمے اور بعض بہت اچھے ترجمے دیگر زبانوں سے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک بات سے غالباً ہم سب واقف ہیں کہ انگر عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کو چھوڑ کر دوسری اہم زبانوں مثلاً روسی، فرانسیسی۔ جرمن وغیرہ زبانوں کے بیشتر تراجم ایسے ہیں جو دراصل ان زبانوں سے راست اردو میں منتقل نہیں کئے گئے بلکہ زیادہ تر انگریزی زبان کے توسط سے ارد

لہ برٹش میوزیم لندن اور ببلیوتک ناسیونال پیرس اور دنیا کے دیگر بڑے کتب خانوں میں جن حضرات نے کام کیا ہے و جانتے ہیں کہ بعض اوقات کتاب کا کیٹلاگ نمبر معلوم کرنے میں بہت دقت لگتا ہے۔ اس لئے میں ... میں بعض جگہ کمیاب کتب کا حوالہ دیتے وقت کتب خانہ اور اس کے کیٹلاگ نمبر کا حوالہ بھی دیدیا کرتا ہوں۔ تاکہ محقق کا وقت بچایا جا سکے۔

رجمہ ہوئے ہیں۔ یعنی اصل زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا اور ہمارے انگریزی داں اہلِ قلم نے اس کا اردو میں کردیا اور کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ کتاب اصل کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کے انگریزی ترجمے کا ترجمہ ہے۔ یہ بھی علمی اخلاقیات لاف ہے۔ بعض لموقر فرانسیسی کتابوں کے ایسے اردو "تراجم" میری نظر سے گزرے ہیں جن کا پہلا صفحہ پڑھ کر اس میں بہ باقی نہیں رہتا کہ فاضل مترجم فرانسیسی زبان سے نابلد تھے۔ لیکن انھوں نے کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا۔ اب ہمارے یں ایسے اہلِ قلم موجود ہیں جو بیرونی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں اس لئے اب اصل زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنا اتنا نہیں رہا۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو اور انگریزی زبان کے ترجمہ سے ترجمہ کرنا ناگزیر ہو تو اصولاً یہ ضروری ہے کہ انگریزی کے نام۔ مصنف۔ اور ایڈیشن کا حوالہ صاف طور پر اردو ترجمے کے دیباچے میں دے دیا جائے۔

ستاد کو شاگرد کا "عطیہ"

قدیم شعراء میں یہ روایت موجود تھی کہ اساتذہ اپنے محبوب شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے ساتھ کبھی کبھی اپنے اشعار بھی شاگردوں کے دیوان میں شامل کر دیتے ے۔ جن کا اعتراف ان کے شاگرد کبھی کبھی نجی صحبتوں میں "عطیۂ استاد" کہہ کر کیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل یہ روایت الٹ گئی ہے۔ ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی کتاب کسی بڑے "استاد" کو لکھنے کے لئے دی گئی۔ استاد صاحب عدیم الفرصتی کی وجہ سے خود یہ کام سرانجام نہ دے سکے اور انھوں نے یہ کام اپنے شاگرد کے سپرد کر دیا۔ شاگرد نے کتاب ی استاد صاحب نے اتمامِ حجت کے لئے "نظرِ ثانی" فرمائی (یا بعض اوقات اس کی بھی زحمت نہیں کی) اور کتاب اپنے نام شائع کرا دی۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ بکی (کیونکہ بعض جگہ نام بکتا ہے کام نہیں بکتا) بعد میں معلوم ہوا کہ کتاب ہر قسم کی طے سے پر تھی۔ اور اس طرح تحقیق کا تماشا بن گیا۔ ایسی مثالیں بہت سی ہیں۔ نام گنوانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے تذہ اپنے شاگردوں سے اس قسم کا "عطیہ" قبول نہ فرمائیں تو کرم ہوگا۔

قید و تبصرہ نگاری

علمی تنقید و تبصرہ نگاری تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ بعض اوقات تنقید تحقیق کا ماحصل ہوتی ہے۔ اس لئے اس قدر بلند سطح کی تحریر کے لئے صاحبِ تحریر کو موضوع پوری دسترس ہونی چاہئے۔ اس ربع صدی میں تنقید پر بہت کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے انگریزی ادب اس کے تنقید نگاروں کی تصانیف سے بہت استفادہ کیا ہے (بلکہ بعض حضرات نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تفادہ کیا ہے) اس کا ہمیں کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہئے۔ بعض تنقیدیں یقیناً اعلیٰ پائے کی لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں قدین نے زیرِ تنقید تحریر کے حسن و قبح کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس دور کا طالب علم کسی تنقیدی مضمون سے توقعات وابستہ کرتا ہے۔ ان میں حسبِ ذیل بھی شامل ہیں۔

پہلے تو یہ کہ مضمون پڑھ کر معلوم ہو کہ یہ مضمون اردو زبان کے کسی ادیب کے کلام کے بارے میں ہے کسی انگریزی یا فرانسیسی یب کے بارے میں نہیں۔ بلا وجہ دوسری زبانوں کے ادیبوں اور ناقدین کا ذکر نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ دوسرے یہ کہ ئے بھی ظاہر کی جائے اس کے قائم کرنے کی وجہ مثال کے ساتھ ضرور بیان کی جائے۔ اس دور کا طالب علم محاورے کے معاملہ و مان لیا جائے تو مان لیا جائے تنقید کے بارے میں کسی کے "فرمائے" ہوئے کو، "مستند" نہیں مانتا۔ وہ تنقید کو ہے وہ کسی بڑے سے بڑے ناقد کی ہو) ایک رائے سمجھتا ہے۔ نہایت قابلِ عزت رائے۔ لیکن بہر حال ایک رائے۔ فیصل نہیں۔ ... رائے قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے ناقدین کی رہنمائی چاہتا ہے۔ اور ناقدین کی رہنمائی اسی وقت

بااثر ہوگی جب زیرِ تنقید موضوع پر مثالیں دے کر رائے کا اظہار کیا جائے اور ان پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ محض خوبصورت الفا
اور چیٹے جملوں کا سہارا لے کر اظہارِ رائے موثر نہیں ہوگا۔

مثالیں دے کر اظہارِ رائے ان تبصرہ نگار حضرات کے لئے بھی ضروری ہے جو کتابوں پر ریویو کرتے ہیں۔ بعض ریویو پڑھ کر
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار صاحب نے کتاب پڑھنے کی زحمت ہی نہیں فرمائی۔ "فہرست مضامین" پڑھ کر اپنی را
داغ دی ہے۔ تبصرہ میں کوئی حوالہ نہیں۔ کوئی مثال نہیں۔ نفسِ مضمون کے بارے میں کوئی بحث نہیں۔ بس رائے ہی رائے
ہے۔ اس قسم کی رائے سے ممکن ہے زیرِ تبصرہ کتاب کا مصنف خوش (یا ناراض) ہو جاتا ہو لیکن کوئی اور ادبی مقصد حاصل نہیں
ہوتا۔ رسائل کے مدیر صاحبان بھی اگر تبصرہ شائع کرتے وقت ان باتوں کی طرف توجہ دیا کریں تو ادب کے طالب علموں کے
حال پر بہت کرم ہوگا۔

ادبی "سرمایہ دار"

جیسا کہ میں نے مضمون کے شروع میں عرض کیا ہمارے بعض اہلِ قلم اور اہلِ تحقیق حضرات نے زبان
اور ادب کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اور سرمایۂ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔
لیکن ان میں بعض ایسے حضرات بھی ہیں جن میں ایک خاص قسم کا واہمۂ برتری پیدا ہو گیا ہے۔ اور ان کے اندازِ فکر و عمل
میں وہی رعونت اور نخوت پیدا ہو گئی ہے جو عموماً سرمایہ داروں یا دوسرے بزعمِ خود غلط "بڑے آدمیوں" میں پیدا ہو جاتی
ان حضرات نے اوائل عمر میں کچھ قابلِ قدر تحقیقی کام کیا۔ ان کا نام چمکا۔ اور کچھ عہدے حاصل ہو گئے۔ اس کے بعد
بذا فراق بینی دبینک۔ انھوں نے لکھنا پڑھنا تقریباً ترک کر دیا اور ایک اندازِ بے نیازی ہر بات میں اختیار کر لیا۔ آپ
انھیں خط لکھیں تو یہ "مصروف" ہونے کی وجہ سے جواب نہیں دیتے۔ بات کریں تو یہ آپ کی نہیں سنتے اپنی ہی کہے جا
ہیں۔ کسی کتاب یا رسالے کو خریدنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ ادب کے ہر شعبے اور ہر موضوع پر اظہارِ رائے اس فیصلہ کن
انداز سے کرتے ہیں جیسے اس میں کسی دوسری رائے کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ عموماً خود پڑھتے یا لکھتے نہیں بلکہ ان کی طرف
سے یا ان کے نام سے دوسرے پڑھتے اور لکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ براہ کرم
دیگر "مصروفیات" کے علاوہ اگر کبھی کبھی ادب کا مطالعہ بھی کر لیا کریں اور جدید کتب و رسائل بھی دیکھ لیا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔

اس دور میں تحقیق کے اصول۔ قواعد۔ معیار۔ اخلاقیات اور دیگر ادبی مسائل کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت
ہے۔ یہ کام ترقی یافتہ ملکوں میں عظیم دانشوروں کی انجمنیں کرتی ہیں جیسے فرانس کی اکادمی۔ اس قسم کی اکادمی قائم کرنے کی
ضرورت ہمارے ملک میں بھی ہے لیکن خدشہ یہی ہے کہ اس پر بھی کہیں تن آسان "ادبی سرمایہ داروں" کا قبضہ نہ ہو جائے
اس لئے جب تک اس قسم کی اکادمی قائم ہو یہ کام ادب کے "عوام" کو ہی کرنا ہوگا۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ جب بھی
کوئی ادبی تحریر یا تحقیقی کام ان کی نظر سے گزرے وہ پہلے خود محنت کر کے اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ وہ تحقیق کے اصول
قواعد اور معیار کے مطابق ہے یا نہیں اور اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں لکھی گئی ہے جو ادبی اخلاقیات اور روایات کے
منافی ہے۔ اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھیں کہ تحقیق میں حقیقت ہی کا مقام سب سے بلند ہے اور اگر انھیں
کوئی قابلِ گرفت بات نظر آئے تو اس پر بلا تامل اظہارِ خیال کریں۔ یہ ایک اہم ذمہ داری ہے جسے پورا کرنا ضروری ہے ورنہ تحقیقی
کام کا معیار بلند نہیں ہوگا بلکہ ممکن ہے رو بہ تنزل ہو جائے۔

ادب کیا ہے؟

وقار احمد رضوی (ایم اے)

ادب ایک تسلسل اور ایک استمرار ہے۔ وہ کوئی جامد چیز نہیں، نامیاتی حرکت ہے۔ ادب ایک سماجی عمل ہے۔ وہ شوکتِ ستان کا نقیب بھی ہے اور حدیثِ گفتنی بھی۔ وہ مقصودِ آدم گری بھی ہے۔ اور حسن کا ابلاغِ تمام بھی۔ ادب نہ فلسفہ ہے اور نہ سائنس نوعِ بشر کے سینے میں فطرت کی ایک امانت ہے جس کا ہر مظہر۔ فطرت کی بالیدگی سے عبارت ہے۔ چاند تاروں کی دنیا ہو یا رغ و ماہی کی وہ ہر جگہ فطرت کی گود میں مقاماتِ نوحہ و نغمہ کی تخلیق کرتا ہے۔

ادب نظری نہیں، فطری چیز ہے۔ وہ فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ جب دنیا کی تلخ حقیقتیں زیادہ سنگین ہو جاتی ہیں۔ تو ادب بید کا نغمہ، آبشاروں کا ترنم اور سبزہ زاروں کی طراوت بن جاتا ہے۔ وہ سبزۂ خوابیدہ سے لالہ و ریحان کے قافلے لے کر نکلتا ہے۔ اور کھوں بھری دنیا کو حرف و حکایت کی شیرینی عطا کرتا ہے۔ اندھیرے میں اجالا اور تاریکیوں میں روشنی پھیلاتا ہے۔

ادب۔ حقیقت خارجی بھی ہے اور حقیقت داخلی بھی۔ وہ زندگی کو مثالیت کی ان بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ جہاں عملی قوتیں شکست و ریخت سے دوچار ہوتی ہیں۔ شاید یہی وہ مقام ہے جب مادہ، شعور سے، وجود، تصور سے، روح، جسم سے، اور عمل، فکر سے پہلے وجود میں آتا ہے۔

ادب ایک عمرانی صداقت ہے وہ خلا میں نہیں، زندگی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ عمرانی تصورات کی تبدیلیوں کے ساتھ ادبی تصورات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ زندگی ہمیشہ نئے قالب بدلتی رہتی ہے۔ اس کا لازمی اثر ادب پر پڑتا ہے۔ نئی روایتیں اور نئے اسلوب پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ستاروں کی گذرگاہوں کو ڈھونڈھ کر اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے لگتا ہے۔ اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر کے اپنی زندگی کی شبِ تار کو سحر بنا لیتا ہے۔

ادب جب DYNAMIC ہوتا ہے۔ تو وہ معاشرے میں ANARCHY تضاد اور پژمردگی کو دور کرتا ہے وہ قوم کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور اس کے عمل کا پیمانہ بھی۔ وہ ٹھہرا ہوا نقطہ نہیں۔ معاشرتی حدوث و ارتقاء کا تخلیقی عکس ہے۔ وہ محض زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اس کی توسیع بھی کرتا ہے۔ وہ بیک وقت ماضی کی یادگار، حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہوتا ہے۔ زندگی مختلف مرئی اور غیر مرئی کیفیات کا مجموعہ ہے۔ ادب حقیقتوں کا متحرک عکس ہے۔ معاشی نظام، طریقِ پیداوار اور مادی حقائق، ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ انسانی ذہن سے باہر ادب کا ایک مادی وجود ہوتا ہے۔ جو شعور اور ادراک کو زندگی کی قدروں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ ادب زندگی کی حرکتِ اعلیٰ ہے۔ جس طرح زندگی بالضد ترقی کرتی ہے اسی طرح ادب بھی ایک تقابلی جنگ ہے۔ وہ متحرک اور مسلسل ہے قدروں کی طرح ... حقیقت مائل بہ ارتقاء ہے۔ ادب بھی نامیاتی عمل ہے۔ اس کی کوئی آخری منزل نہیں۔ تناقض، تردید اور تخلیق جدید اس ... استمرار کے مدارج ہیں۔

ادب کی طرح رقص، موسیقی، سنگ تراشی اور مصوری سب میں حرکت یا خطوط کا توازن یا تناسب مشترک طور پر ملتا ہے۔ رقص تمام فنونِ لطیفہ کا ابتدائی نقطہ ہے۔ وہ فطرت کی مہیب طاقتوں کے خلاف ناطق قدروں کی پذیرائی کرتا ہے۔ شاعری آواز، مفہوم اور کنایہ کا نام ہے۔ اور رقص اشاروں اور علامات کی شاعری ہے۔ وہ روایت کو اشاریت کی آخری شکل دیتا ہے۔

موسیقی ایک فنِ لطیف ہے۔ اس میں جذبہ کی کارفرمائی ہے۔ خالص موسیقی سُروں کا نام ہے۔ اس کا براہِ راست تعلق انسانی جذبات سے ہے۔ موسیقی جذبات کو متاثر کرتی ہے۔ نقاشی اور مصوری جذبات کو متاثر کرتے ہیں مگر عقل کے ذریعہ۔ نقاشی اور مصوری جذبات و تاثرات کی تعبیر فکر کے ذریعہ کرتے ہیں کہ تخیل میں معونتِ فکر ہوتی ہے۔ لیکن جامہ حسی ہوتا ہے۔ ادب ایک فنِ جمیل ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ قضایائے عقلیہ کے ساتھ اپنی خصوصی توجہ عواطف کی طرف بھی کرے۔ ادب میں جذبے کا مقام موسیقی کی طرح عملی نہیں بلکہ عقلی ہے۔

ادب سماجی عمل ہونے کے علاوہ ایک انفرادی اور شخصی ماحول بھی رکھتا ہے۔ ادیب کا وجدان، ذاتی احوال، دکھ الم سے گزر کر زندگی کی وسعتوں کا احاطہ کرتا ہے اس کا عمیق ذہن تجربے کی تہہ تک پہنچ کر اس کی نظر کو بصیرت کی تابانی سے منور کرتا ہے۔ کلام میں صداقت، جوش اور عمل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب فنکار ذاتی تجربوں سے گذرتا ہے اس لئے حُسن، صداقت اور حق ادب کی بنیادی قدریں ہیں۔ عظیم ادب اپنے خالق کی شخصیت کا حسین پرتو ہوتا ہے وہ کائنات کے اسرار و رموز کو انفرادی اور اجتماعی زندگی سے فکری طور پر مربوط کرتا ہے۔ ادیب کا ذوقِ جمال، ادب کو حسن و جمال سے آراستہ کرتا ہے۔ اور داخل کا مستحکم یقین، قوتِ تاثیر پیدا کرتا ہے۔ وہ سوز دروں کی آگ سے ادب کو پختہ کرتا ہے۔ اور اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کرتا ہے۔

ادیب اعلیٰ انسانی قدروں کا محافظ اور زندگی کا ترجمان و مفسر ہوتا ہے۔ وہ اپنے سینے میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہے۔ زندگی فلسفہ کا آہنگ نہیں، جذبات کا نغمہ ہے۔ جو ادب میں داخلی تاثر پیدا کرتا ہے۔ ادیب کے داخلی احساسات اور تجربات وقت کے تہذیبی مزاج کی دین ہوتے ہیں۔ وقت کے تہذیبی مزاج سے ادیب کا جمالیاتی شعور نکھرتا ہے۔ ادیب کا جمالیاتی شعور اسے فطری طور پر تناسب اور ہم آہنگی، توازن اور اعتدال کی جمالیاتی قدروں کے حصول پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ انسانی ذہن کی اس سطح تک رہنمائی کرتا ہے۔ جہاں زندگی کا ظاہری تضاد تحلیل ہو کر، ادراکِ حقیقت کا موجب ہوتا ہے۔ ادیب کے ذاتی اور شخصی موثرات، تمدنی اور سماجی عوامل کے زیر اثر ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ فرد کی تعمیر فرد کے ذاتی شعور اور سماجی ارتقاء کے تحت ہوتی ہے۔ جو تاریخی عمل کی ماہیت سے مطابقت رکھتی ہیں۔

ادب، حقائق کی خالص تعبیر ہی نہیں۔ وہ شخصیتِ ادیب کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ادیب کی مزاجی ہیئت اور طرزِ ادا کی طرح ادب میں اثر اندازی اور اثر پذیری کی طاقتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ادیبوں کے جدا جدا اسلوب ہوتے ہیں۔ ادب ایسے ہی مختلف تاثرات و تاثیرات کے مجموعے کا نام ہے۔

زندگی حقائق یا صرف خارجی احوال کے تابع نہیں۔ وہ ان اندرونی جذبات کے بھی تابع ہے جو خالقِ ارادہ ہیں — عزم کو بیدار کرتے ہیں۔ انسانی رفتار کو متاثر کرتے ہیں۔ اخلاق کو مہذب بناتے ہیں۔ اور راہِ حیات کی حد بندی کرتے ہیں۔ جو ادب شخصیتِ ادیب کی ترجمانی کرے پڑھنے والے کے دل میں ایسے ہی تاثرات پیدا کرے جیسے کہ ادیب و شاعر نے محسوس کئے وہ ادب حیاتِ انسانی کی سچی دستاویز ہوگا۔ اس سے حیات و کائنات کا گہرا مطالعہ حاصل ہوگا۔

ادب محض استادی یا فنی کاریگری ہی نہیں۔ وہ فرشتوں کو آدم کی تڑپ اور آدم کو آدابِ خداوندی سکھاتا ہے۔ وہ قبا لالہ و گل

ی بخیہ گری ہی نہیں، نہ زاہد شب زندہ دار کی صحبتِ نیم شبی میں فرد کو ارادہ، علم اور نظریے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ ادب کسی خلاق دماغ ی خود رو تحریک کا نتیجہ بھی ہے اور وہ زندگی کی تخیلی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ہر دور کا ادب مقصدی رہا ہے۔ بغیر مقصد کے ادب پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی نظریۂ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ فن بلا ارادہ اور لاشعوری طور پر پہلے وجود میں آتا ہے۔ اس کے اصول اور نظریات بعد میں مدون اور مرتب کئے جاتے ہیں۔ تاریخ کے گذشتہ ادوار میں نظریہ، غیر شعوری طور پر ادب میں راہ پاتا تھا۔ آج نظریہ ہر اچھے اور بڑے فنکار کے افکار کا جزو ہے۔ عقائد ادب میں زندگی کی بصیرت لاتے ہیں۔ خیالات، انسانی ذہن میں خارجی اور ادی حقیقتوں کے عکس کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ادیب کے دل میں جو احساسِ حسن پیدا ہوتا ہے۔ وہ خارجی حقائق کے شعور اور ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ احساس، انفرادیت سے گذر کر اجتماعی شکل، اختیار کرتا ہے۔ ادبی تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب ادیب خارجی یا داخلی حیاتِ جمال کی عکاسی اس طور کرے کہ تصویر کا حقیقی رخ پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔ وہ قوت جو اس تصویر کشی کی تکمیل کرتی ہے۔ اس کو قوت فکریہ حسیہ یا وتِ خیالیہ IMAGINATION کہتے ہیں۔ جذبہ کی طرح خیال بھی ادب کا ایک ضروری عنصر ہے۔ خاص طور سے ان فنون میں جن میں جذبہ کو دخل ہے۔ خالص موسیقی کے علاوہ تمام فنون میں فکر کو بنیادی رکن کا درجہ حاصل ہے۔ فکر کو معنویت یا نظریے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ادب میں فکر یا نظریہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادب میں رونق اور قوت پیدا کرتا ہے۔ زندگی اپنی دوامی رفتارِ ارضی میں عقلِ متفکر سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ اور شعورِ دافع یا جذبۂ محرک پر تکیہ کرتی ہے۔ عقلِ متفکر اور جذبۂ محرک ادب تاریخی پیدا کرتا ہے۔

ادب میں فکر کی اس قدر مقدار ہی کافی ہے جو آثارِ ادبیہ کو مضبوط اور مستحکم بنا دے۔ لیکن اگر مقصد عقل کی امداد کرنا ہے خالص افکار کے ذریعہ۔ تو وہ علم (SCIENCE) ہے۔ اس کو عقلیتِ خالصہ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ جو نہ فن ہے اور نہ ادب ر علم ہے۔

وہ زبان جو حقائقِ علمی کی تعبیر دقیق انداز میں کرے وہ شخصیتِ ادیب کی ترجمانی نہیں کرتی۔ اس اعتبار سے فلسفہ، طبیعیات میا، اور حساب کا شمار ادب میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ اصطلاحی زبان میں آثارِ شخصی کو سمونے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ علمی زبان ۔ ضوعی مسائل اور حقائقِ عقلی سے بحث کرتی ہے۔ اس میں جذبہ کو دخل نہیں ہوتا۔ عقلی اسلوب یا رسمی طرزِ ادا۔ باریکی میں علمِ ریاضی زبان سے قریب ہوتا ہے۔ بسا اوقات علمِ ریاضی کی زبان، دقیق ترین زبان ہوتی ہے۔ خالص عقلی حقائق کی تصویر کشی کے لئے س سے زیادہ سچی یا راست انداز کوئی اور زبان بھی نہیں ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ادب اور علم میں فرق ہے۔ یہ فرق علمی اور ادبی طبیعت کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ طبیعت علمیہ ہے اور دوسری طبیعتِ ادبیہ۔ ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے۔ وہی علم اور ادب کے درمیان ہے۔ طبیعتِ علمیہ کا مقصد۔ اشیاء کا تحلیل و تجزیہ، ان کے بارے میں غور و خوض، اور ان کی نشو و نما سے بحث کرنا ہے۔ جس طرح ایک ماہر نباتات اس پودوں اور پھولوں سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ پھر ان کے اجزاء کے فرائض بیان کرتا ہے۔ وہ ان کے تعلق بالغیر کی طرح کرتے ہوئے ان کے مدارج حیات کا بھی تعین کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح طبیعتِ علمیہ عناصر اور ان کے تعلق بالغیر سے بحث کرتی ہے۔ ان بحثوں سے ضوابطِ علمیہ اور عقلی اصول تشکیل پاتے ہیں۔

طبیعتِ ادبیہ۔ اشیاء سے اس طور پر بحث کرتی ہے۔ کہ ان کا تعلق انسانی جذبات سے کیا ہے؟ اور وہ کیا چیزیں ہیں جو حسِ انسانی میں شعور اور وجدان کو بیدار کرتی ہیں۔

پھول مرتب ہیں اور خوبصورت ہیں۔ وہ انسان کی لطف اندوزی کے لئے ہیں۔ انسان ان کی خوشبو سے محظوظ ہوتا ہے۔ ان
فطری خوبصورتی اور جباتِ طبعی کا سراغ ملتا ہے۔ ادب جمالِ فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ہمارے لئے سرور و انبساط بہم پہنچاتا ہے۔
یہ علماء نہیں ہیں۔ جو ہم کو فطرت کی بوقلمونی سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہ ادیب کی ذات ہے جو ہمارے اوپر فطرت کے اسرار د
افشا کرتی ہے۔ ادیب ہمارے سامنے فطرت کی نیرنگیاں پیش کرتا ہے۔ ان عمیق معانی کی تفسیر کرتا ہے جو تمام اور ہیئت کے امتزاج سے ا
کے جمالیاتی رشتوں کو استوار کرتے ہیں کیفیت کی زبان، داخلی تاثر کا اشاریہ ہوتی ہے۔ وہ فنی تقاضوں اور انفرادی داخلیت کا
جوئے خوش آب کی طرح، عام زندگی سے جوڑتی ہے۔

عالم اور ادیب کے درمیان فرق کو اس طرح پہچانا جا سکتا ہے۔ کہ عالم کا مقصد اشیاء میں باہم مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ ان
بارے میں سوچتا ہے۔ ادیب کی توجہ طبیعت کی طرف ہوتی ہے۔ وہ ہم کو وجدان سے قریب کرتا ہے۔ اور وجدانی آواز دتا ثر
ملاتا ہے۔ عالم اشیاء کی تعبیر حسب دقیق پیرایہ میں کرتا ہے۔ اس کا نام علم ہے۔ اثرِ ادبی شخصیتِ ادیب کی ترجمانی کرتا ہے۔ اثرِ علمی اد
کی خصوصیاتِ نفسی کی تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ اس کا رجحان اسلوب عقلی کی طرف ہوتا ہے۔ جس کا تعلق ذات سے نہیں، خارجی دنیا

اس تغایر سے نہ فنونِ ادبی میں، تضادِ تام دکھانا مقصود ہے۔ اور نہ اس سے علم اور ادب میں شعوری رشتے کی نفی ہوتی ہے
کہنے کی بات یہ ہے کہ بعض کتابیں ایسی ہیں جو علمی ہوتی ہیں۔ ان میں ادبی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں ان کتابوں میں قضایائے ع
شعور و وجدان کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔ ادبِ فنی اپنے اندر قوت پیدا کرنے کے لئے حقائق یا عقلیت کا محتاج ہے اور عقل و شعور کے
تعاون سے فنِ کتابی کی ساخت استوار ہوتی ہے۔ آثارِ ادبی میں عقل و شعور کی پذیرائی، تعمیرِ حقیقت کرتی ہے۔ حقیقت لباسِ مجاز
جلوہ گر ہو کر قبولِ عام کی سند پاتی ہے۔ حقیقتِ عقلیہ اگر جذبے کا دامن چھوڑ دے تو نہ قصیدہ حیاتِ جاوداں پا سکتا ہے اور نہ
قوانینِ طلوع و غروب کا علم عالم کے مطالعۂ جمال کو ناقص نہیں کرتا تا وقتیکہ وہ خود اپنی لطافتِ حسی کو نہ کھو بیٹھے۔
نظارۂ جمال کی خوشیوں کو بھول کر اپنی تمام تر توجہ قوانینِ کائنات کی طرف منعطف نہ کر دے۔

انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقل اور شعور کے درمیان توازن برقرار رکھے۔ فکر اور وجدان دونوں کو ساتھ لے کر
عقلیت اور حسیت میں سے دونوں کو ایک دوسرے پر غالب آنے نہ دے۔ ان میں سے ہر طاقت کو زندہ رکھے۔ نہ جذبات
غلام بن جائے اور نہ بندۂ عقل و افکار۔ جذبے کی بندگی سے فکری سطحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور محض عقل کی پاسبانی، زندگی کی
ہیں حیاتِ ادبی کی فطری نشاط کو زائل کر دیتی ہے۔

ادب نام ہے کلامِ منقول اور مروی کا اور ادب تاریخی نام ہے اس کلامِ منقول اور اس کے متعلقہ علوم سمجھنے کا۔ ادبِ تاریخی
اور ادب کے درمیان ایک چیز ہے۔ اس میں علم کی موضوعیت اور ادب کی ذاتیت دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

مورخِ ادبی عقلِ انسانی اور شعورِ انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے۔ مورخِ ادبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ علومِ عقلیہ
فنونِ لطیفہ کے ساتھ، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کا بھی مطالعہ کرے۔

تاریخ کی وہ کتابیں جو محض خشک حوادث کا مجموعہ ہوں۔ ان میں نہ فہم و فراست کو دخل ہو۔ نہ ان کی بنیاد علت و معل
ہو۔ اور نہ ان میں حوادث کے باہم تعلق پر زور دیا گیا ہو۔ ایسی کتابیں پراگندہ قصوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ ا
تاریخ کا مادۂ خام کہا جا سکتا ہے۔ اس مادۂ خام سے روشن خیال، وسیع المشرب اور صاحب طرز مورخِ ادبی استفادہ کرتا ہے
تاریخِ ادب سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب پر کتنے دور گذرے؟ اور ماحول اور زمانہ کے اختلاف اور تضاد و موثرات

ادب پر کیا اثر پڑا؟ ۔ تاریخِ ادب انھیں عوامل اور موثرات سے بحث کرتی ہے ۔ جن سے ادبی ذوق اور فن متاثر ہوتا ہے ۔ وہ علم اور فن کی درمیانی کڑی ہے جہاں حقائق اور جذبات دونوں جمع ہو گئے ہیں ۔ شاید اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تاریخ بھی ایک علم ہے ۔

تاریخ کے مادی نظریے کے مطابق، عقل کو تاریخ کی بنیادی غرض شمار کیا جاتا ہے ۔ رجالِ تاریخ نے جن واقعات سے بحث کی ہے ان کو سچائی سے نقل کر دینا تاریخی ثقافت کا نشانِ اول ہے ۔

ادب تاریخی واقعات کی صحیح ترجمانی اور صحتِ بیان پر بھی زور دیتا ہے ۔ اور ان کے اسباب و محرکات سے بھی بحث کرتا ہے ۔ وہ عقلِ مدبر اور انفعالِ محرک سے چراغِ راہ گذر اور جذبات و وجدان کی آگ پیدا کرتا ہے ۔ جو کائنات کو نئے اجالوں سے روشن کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جمالیاتی تاثیر و تاثر یا جذبے کو ادبِ تاریخی میں ثانوی درجہ حاصل ہے ۔

سیاسی زندگی کا اضطراب اور فساد، ادبی زندگی میں فساد اور اضطراب پیدا کرتا ہے ۔ لیکن سیاست کو ادب کے پرکھنے کی کسوٹی نہیں بنایا جا سکتا ۔ ہر عہد کا ادب اپنے عہد کی روایتوں کا نقیب ہوتا ہے ۔ مادی تبدیلی سے داخلی کیفیتیں بدل جاتی ہیں ۔ ساز بدلتے ہیں تو نئے راگ پیدا ہوتے ہیں ۔ تغیرات مادی چیز ہیں ۔ وہ تخیل پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ سیاسی تبدیلی اسلوب کو تخیلی حقیقت اور واقعیت کی طرف لے جاتی ہیں ۔ کبھی سیاسی زندگی کی ترقی، ادبی ترقی کا باعث ہوتی ہے ۔ اور کبھی سیاسی زندگی کا زوال بھی ادبی ترقی کا موجب ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے ادب اور سیاست کا تعلق اکثر اوقات معکوسی ہے ۔ ادب میں نظریے سے انکار، قوت سے انکار ہے ۔ لیکن اگر نظریہ کسی طبقاتی کشمکش یا سیاسی پارٹی کا آرگن ہے ۔ تو وہ سیاسی پروپیگنڈا ہوگا ۔ ادب نہیں ہوگا ۔ اس کو ادبی رسالت مرتبہ نہیں دیا جا سکتا ۔

ادب سیاسی پروپیگنڈا نہیں ۔ وہ ایک تجربے کراں ہے ۔ اس میں چاندنی، بہار، جوانی نغمہ اور سبزے کی دلکشی ہے ۔ اسکو تاریخی جبریت کا شکار نہیں بنانا چاہیئے ۔ اس سے شاعر یا ادیب کا مذاقِ سخن بگڑ جاتا ہے ۔

ادب کا ایک ہمہ گیر اور آفاقی ذہن ہوتا ہے ۔ وہ ما قبلِ منطق حسیات کے بعد افادیت پر زور دیتا ہے ۔ جس طرح سماجی اور سیاسی آزادی کی ضرورت ہے ۔ عقلی اور شعوری زندگی کیلئے بھی آزادی رائے ضروری ہے ۔ آزادئ رائے ادب کو ابھارتی ہے ۔ آزادی ایک ایسی طاقت ہے جو ادب کو EXTENTIALISM وجودیت اور ادبی ثقافت کو حرکت کیطرف لیجاتی ہے ۔ ادب ۔ مذہب یا ذہنی علوم کا وسیلہ بننے سے آزاد ہے ۔ زندہ ادب پائدار اور دیرپا ہوتا ہے ۔ وہ وقتی یا لمحاتی چیز نہیں ۔ وہ مذہبی تقدیسوں اور احتراموں سے آزادی کا خواہش مند ہوتا ہے ۔ وہ بحث، نقد، تحلیل، شک، انکار اور تردید کی بارگاہ میں سر جھکاتا ہے وہ ہمیشہ پڑھا جاتا ہے ۔ بار بار پڑھنے سے اس کی رونق اور جمال میں اضافہ ہوتا ہے ۔

مذہب سے ادب کا تعلق صرف اتنا ہے کہ مذہب کلچر اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے ادب کا مقصد بھی تہذیبِ نفس اور تثقیف و تربیت ہوتا ہے ۔ دینی ثقافت ادب کو اعیان کا تصور دیتی ہے ۔ ادب اپنے اندر اقدارِ اعلیٰ کی ایک معروضی ذہنی شکل پیدا کرنے کے بعد لوگوں میں اخلاقِ فاضلہ اور سیرتِ محمودہ کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ ادبِ نفسی، اجتماعی ہیئت میں تفسیر اور ثقافتی گوشوں میں تنوع پیدا کرتا ہے ۔ اچھا اسلوب علم یا صناعی ۔ ہیں، اخلاقی اقدار کا معلم ہوتا ہے ۔ نثر و نظم، لغت، نحو، بلاغت اور نقد علومِ ادبی ہیں ۔ یہ ادبی ثقافت کے ستون ہیں ۔ یہ علوم اپنا مستقل درجہ رکھتے ہیں ۔ اور ادبِ فنی سے ہٹ کر ان کی اپنی الگ ایک حیثیت ہے ۔ ان علوم کی اہمیت یہ ہے کہ یہ علوم ادیب کی شخصیت اور اس کے ذہن کی جلا کرتے ہیں ۔ ادیب، ادب کی تخلیق میں ان سے مدد لیتا ہے ۔ یہ علوم ادیب کے فہم و ادراک کو ادبی بلوغ عطا کرتے ہیں ۔ اور ثقافتِ ادبی کی تعمیر کرتے ہیں ۔

صادق القادری ـــــ ایک شعلۂ مستعجل

نظیر صدیقی

نیاز صاحب محترم سلام ونیاز

میں روزنامہ "جنگ" باقاعدگی کے ساتھ روز نہیں پڑھتا لیکن ۲۸ اپریل کا "جنگ" نظر سے گزرا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میرے جوانمرگ دوست صادق القادری صادق کو اس کی شاعری پر جیسی داد آپ نے دی ہے ویسی بہت سے بڑے شاعروں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔

آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ سے صادق کا تحریری تعارف میں نے ہی کرایا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ زندہ تھا۔ میں نے اس کی زندگی میں اس کی شاعری پر ایک مضمون لکھا تھا جسے اشاعت کے لئے آپ کے پاس بھیجا تو آپ نے فرمایا، آپ مضمون شائع کرنے کی بجائے اس کے کلام کا انتخاب شایع کریں گے۔ چنانچہ میں نے اس کے کلام کی ایک نقل آپ کے پاس بھیج دی تھی، آپ نے اس کے کلام کا انتخاب مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا لیکن اس وقت تک صادق غالباً اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ پھر نہ جانے کیونکر آپ نے اس کی وفات کے بعد اس کی شاعری سے متعلق میرا مضمون بھی شائع کر ڈالا تھا۔ وہ پرچہ یقیناً میرے یہاں موجود ہوگا۔ لیکن اتنی فرصت نہیں کہ رسالوں کے انبار میں سے نکال سکوں۔ یہ واقعہ غالباً ۵۷-۱۹۵۸ء کے درمیان کا ہے۔ صادق کو میرے مضمون سے فائدہ تو خیر کیا پہنچتا لیکن اسے بڑی تمنا تھی کہ میرا مضمون اس کی زندگی میں شائع ہو جاتا۔

صادق کی وفات کے بعد میں نے اس کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا جسے بوجوہ آج تک شائع نہ کر سکا۔ اول تو اس کے گھر والوں نے اس مضمون کی اشاعت کی مخالفت کی تھی دوسرے یہ کہ کچھ عرصہ پہلے کراچی کے ایک رسالے کے خاص نمبر کے لئے وہ بھیجا بھی گیا تو اسے نہ شائع کیا گیا نہ واپس کیا گیا۔ چونکہ آپ کو صادق سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اس لئے اس کا قلمی خاکہ بھیج رہا ہوں۔ اگر پسند آئے تو "نگار" میں لفظ بہ لفظ شائع کر دیں۔ بصورت دیگر اسے بیرنگ واپس بھیجنے کی زحمت ضرور گوارا فرمائیں۔ میرے پاس اس مضمون کی کوئی اور نقل نہیں ہے۔

میں نے جس زمانے میں صادق کی شاعری پر مضمون لکھا تھا اس کے کلام کا انتخاب بھی کیا تھا۔ وہ انتخاب بھی ارسال ہے۔ اگر جی چاہے تو اسے بھی شائع کر ڈالیں ورنہ اسے بھی واپس بھیجدیں۔

صادق کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہو سکا۔ اگر آپ شائع کرنے (محض حرزِ جاں بنانے پر نہیں) پر آمادہ ہوں تو اس کے گھر والوں سے کہہ کر مجموعۂ کلام آپ کے پاس بھجوا دوں۔

غالباً ۱۹۵۱ء میں چاٹگام میں ایک مشاعرہ تھا۔ ڈھاکے سے بلائے جانے والے شعرا ایک ساتھ چاٹگام روانہ ہو رہے
ے۔ اس قافلے میں صادق بھی تھا جو بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود جاڑوں کے موسم میں رات کی گاڑی سے ہم لوگوں کے ساتھ
ٹگام جا رہا تھا۔ اس وقت تک میرے اور صادق کے مراسم جان پہچان تک محدود تھے۔ میں نے اسے ڈھاکے کی ایک ادبی
جلس میں ایک دو مرتبہ غزل پڑھتے سنا تھا۔ اس کا ایک شعر مجھے بہت پسند آیا تھا۔ پھر بھی اس کی ذات یا اس کی شاعری میری
چسپی کا مرکز نہ بن سکی تھی۔ بیماری کی حالت میں اس کے سفر کرنے سے مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ اور جب کسی نے میرے کان میں
ا کہ صادق کو اکثر حرارت رہا کرتی ہے اور کبھی کبھی منہ سے خون بھی آجاتا ہے تو میری کوفت اس غصے میں تبدیل ہو گئی کہ
تنے دور دراز کے مشاعرے میں مریض و مدقوق شاعر کی شرکت کیا ضرور۔ اب میں ڈھاکا اسٹیشن ہی سے اس بات کی کوشش
نے لگا کہ جہاں تک ممکن ہو صادق سے دور رہوں۔ چاٹگام پہنچکر صادق کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی۔ پھر بھی وہ کمبل اوڑھے
شاعرے میں شریک ہونے سے باز نہ رہا۔ جب اس کے پڑھنے کی باری آئی تو اس نے پہلے کچھ رباعیات اور قطعات سنائے
ر آخر میں غزل۔ وہ ترنم سے پڑھتا تھا اور جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں میں اسے ایک دو مرتبہ غزل پڑھتے سن چکا تھا لیکن
ں سے مجھے نہ تو اس کے کلام کی دلدوزی کا پوری طرح اندازہ ہو سکا تھا نہ اس کے ترنم کی دل آویزی کا۔ چاٹگام کے مشاعرے
ں علالت کے باوجود اس کا ترنم بہت ہی دل پذیر تھا اور اس کے اشعار سب کے سب بڑے درد آگیں۔ اس کے اشعار کے
، کرب اور ترنم کے سوز و گداز نے میرے دل و دماغ میں نہ صرف قیامت برپا کر دی بلکہ مجھے اس کی قربت حاصل کرنے
بھی آرزومند بنا دیا۔ شاید مشاعرے ہی میں میرے اس کے درمیان یہ بات طے پا گئی کہ ڈھاکے واپس پہنچ کے دوسرے
ن وہ صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یا تو میں اس کے قریب جانے سے احتراز کر رہا تھا یا پھر میں اپنے
پ کو اس کا ہم پیالہ و ہم نوالہ پا کر خوش ہو رہا تھا۔

اس دن سے صادق اکثر میرے یہاں آنے لگا۔ ہم دونوں بہت جلد "آپ" سے "تم" تک پہنچ گئے۔ اس میں تکلف
ر تمکنت ذرا بھی نہ تھی۔ وہ پیٹ کا ہلکا تو نہ تھا لیکن اپنے کسی دوست کو اپنا رازدار بنانے کے لئے اس بات کا منتظر نہیں

صادق ۲۵ جنوری ۱۹۲۷ء کو رنگون میں پیدا ہوا جہاں اس کے والد ملازمت کرتے تھے۔ ۸ مہینے کی عمر میں کلکتے لے آیا گیا۔
تدائی تعلیم کلکتے کے ایک انگریزی اسکول ST JAMES سے حاصل کی۔ اپنی ذہانت کی بدولت امتحان میں ہمیشہ
ل یا دوم آتا۔ ۱۹۴۴ء میں کلکتہ مدرسے سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۷-۴۹ء تک اسلامیہ کالج کلکتہ سے آئی اے اور
اے کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۰ء میں کلکتے سے اپنے خاندان کے ساتھ ڈھاکے چلا آیا۔ یہاں پاکستان پی اینڈ ٹی آڈٹ آفس میں کلرک کی
یت سے ملازم رہا۔ ۱۹۵۳ء میں شادی کی۔ ۱۹۵۴ء میں اس کی صحت زیادہ خراب رہنے لگی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی شب کو کلکتے میں وفات پائی

رہتا تھا کہ پہلے خود اس کو راز دار بنا لیا جائے ۔ اس نے باتوں باتوں میں اپنی زندگی کے کئی راز میرے سپرد کر دیئے اور یہ تاکید کبھی نہیں کی کہ اسے اپنے ہی تک رکھنا ۔ دوستی کے معاملے میں وہ صرف اعتماد کا قائل تھا احتیاط کا نہیں ۔

صادق کا آبائی وطن مرشد آباد تھا ۔ لیکن اس کی پیدائش رنگون میں ہوئی اور پرورش و پرداخت کلکتے میں ، ہر بڑے شہر کی طرح کلکتے کی بھی ایک اپنی تہذیب ہے ۔ جس کے اثرات اور عناصر صادق کی ذات میں دیکھے جا سکتے تھے ۔ اس کے ادبی ذوق کی پاکیزگی میں شک نہیں لیکن وہ شعر و ادب کا سنجیدہ طالب علم نہ تھا ۔ اردو کے غزل گو شاعروں میں میں نے اسے شاد عظیم آبادی کا مداح پایا ۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں صادق نے ابرؔ احسنی کی شاگردی اختیار کر لی تھی لیکن جب استاد نے اس کے اس شعر پر ؎

بات یہ اور ہے کچھ کہنے نہ دے پاسِ وفا
آپ کے جور سے تکلیف مگر ہوتی ہے

یہ اعتراض کیا کہ غزل میں اس قسم کا مضمون غزل کی روایت کے خلاف ہے تو اس نے ان سے اصلاح لینا ترک کر دی اور انھیں لکھ بھیجا کہ میں روایت پر حقیقت کو قربان نہیں کر سکتا ۔

ابرؔ احسنی سے ترک تعلق کے بعد اس نے کسی اور سے اصلاح نہیں لی ۔ جب میرے اس کے مراسم گہرے تعلقات میں تبدیل ہو گئے تو ہر ملاقات میں اپنا تازہ کلام سنا کر میری رائے ضرور طلب کرتا ۔ اگر میں کوئی ترمیم پیش کرتا تو اسے قبول بھی کر لیتا ۔ خود میں نے بھی کئی مرتبہ اس کے مشورے کے مطابق اپنے اشعار میں ترمیم کی ہے ۔

صادق کو زود گوئی اور بدیہہ گوئی دونوں پر خاصی قدرت تھی ۔ میں نے کئی مرتبہ اسے کم سے کم وقت میں مشاعرے یا ریڈیو کے لئے نظمیں لکھتے دیکھا اور کئی موقعوں پر فی البدیہہ شعر کہتے پایا ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کے فی البدیہہ شعر محفوظ نہیں رکھے ۔ البتہ ایک شعر کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے ۔ ایک دفعہ طویل وقفے کے بعد وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا ۔ میں گھر پر موجود نہیں تھا وہ ایک شعر لکھ کر چھوڑ گیا جس کا دوسرا مصرع یہ ہے ۔ ؏

تم سے ملے ہوئے تو زمانہ گذر گیا

اس کا حافظہ غیر معمولی تو نہیں مگر قوی ضرور تھا ۔ دوسروں کے جو شعر اسے پسند تھے وہ اسے ہمیشہ یاد رہتے تھے ۔ اس کے اپنے اشعار کی بیاض اس کا حافظہ ہی تھا ۔ کاغذ کی بیاض اس نے میرے اصرار سے بنائی ۔ لیکن اس میں اس نے اپنے تمام اشعار منتقل نہیں کئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے اشعار اس کے ساتھ دفن ہو گئے ۔

صادق میں اکتسابی قوت بلا کی تھی ۔ اپنی مترنم آواز کی بنا پر اسے گانے کے فن سے خاصا لگاؤ تھا ۔ اگرچہ اس نے اس فن کو کسی ماہر فن سے باقاعدگی کے ساتھ نہیں سیکھا تھا پھر بھی وہ کئی دھنوں اور راگوں سے واقف تھا ۔ فلم کے گانے خواہ وہ کسی دھن میں ہوں ان کو دو ایک مرتبہ سن کر اسی دھن میں سنا دینا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا ۔ ہندوستان اور پاکستان کے جن مشہور شاعروں کو اس نے ترنم سے پڑھتے سنا تھا ان کی مکمل نقالی پر اسے پوری قدرت تھی ۔ لیکن اپنی اس صلاحیت کے باوجود وہ اپنا کلام نہ تو فلمی گانوں کی دھن میں پڑھتا تھا اور نہ کسی مشہور شاعر کی طرز میں ۔ اس کے پڑھنے کا انداز سو فیصدی شاعرانہ بھی تھا اور انفرادی بھی ۔

صادق صرف غزل ، قطعہ اور رباعی کا شاعر نہ تھا وہ کبھی کبھار گیت بھی لکھتا تھا اور افسانے بھی ۔ میں نے اس کا

فسانہ نہیں پڑھا لیکن اس کے دو ایک گیت خود اس کی زبان سے سنے تھے اور وہ گیت مجھے بہت پسند آئے تھے۔

صادق شگفتہ مزاج بھی تھا اور حاضر جواب بھی۔ زندگی کی سختیوں اور تلخیوں نے اسے مار رکھا تھا پھر بھی صحبتوں اور ں میں وہ ہمیشہ ہنستے ہنساتے پایا گیا۔ اسے لطیفوں سے لطف اندوز ہونا بھی آتا تھا اور لطیفوں کو سلیقے سے بیان کرنا گفتگو اور تحریر (میری مراد نثر سے ہے شاعری سے نہیں) دونوں میں رعایت لفظی اور ذومعنی الفاظ ([illegible]) سے اٹھانے کا بڑا عادی تھا۔ یہاں تک کہ اپنی وفات سے دو روز پہلے اس نے جو خط اپنی بہن کے نام بھیجا اس میں بھی ذومعنی ظے سے کام لیے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے مرض کی تشخیص کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ "ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کو ٹی بی بہت ر ہے اور اس کی کوئی فکر نہیں۔ لیکن آپ کا دل بہت بڑھ گیا ہے ...... بہر حال دل بڑھ گیا ہے تو اچھی بات جلد کب کسی کا دل بڑھتا ہے۔"

صادق کی حاضر جوابی حسبِ موقع مزاحیہ بھی ہوتی تھی اور طنزیہ بھی۔ ایک مرتبہ بیگم حیدر (ان کا ذکر آگے آئے گا) کے یہاں ست تھی۔ صادق بھی موجود تھا۔ اس نشست میں ایک شاعر ایسے بھی تھے جن سے دوسری تیسری غزل پڑھنے کی فرمائش کی جاتی ی اس فرمائش کو رد نہ کرتے تھے۔ لیکن انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ اس قسم کی فرمائش جو شاعر کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ صادق ھی کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے بڑے دوستانہ لہجے میں صادق سے کہا کہ اگر آپ سے دوبارہ پڑھنے کو کہا جائے تو انکار کر دیجیے م لوگ شاعر ہیں یا اربابِ نشاط۔ صادق ان کی نیت اور ذہنیت دونوں سے واقف تھا۔ اس نے کہا آپ ٹھیک کہتے لیکن کیا کروں۔ جس طرح آپ اخلاقاً مجبور ہو جاتے ہیں میں بھی اخلاقاً مجبور ہو جاتا ہوں۔

تحریر ہو یا تقریر اپنے مافی الضمیر کا اظہار آسان نہیں۔ اسی لئے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اپنی مادری زبان بھی روانی ساتھ نہیں بول پاتے۔ لیکن صادق اردو، انگریزی اور بنگلہ تینوں زبانوں سے بے تکلف تھا۔ میں نے اسے ان ن زبانوں میں یکساں سہولت اور سلاست کے ساتھ گفتگو کرتے پایا۔ ایک مرتبہ اس کے ھ ایک انگریزی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں انگریزی فلم کا مکالمہ سمجھنے میں بہت بودا واقع ہوا ہوں۔ میرے کان ک انگریزی لہجے سے مانوس نہیں ہو سکے لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میری طرح فلم کم دیکھنے کے باوجود صادق کو لم کے سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی فلم دیکھنے کے بعد اس نے مجھے فلم کی پوری کہانی بھی بتائی اور مکالمے کے چھے جملے بھی سنائے۔

صادق ملازمت کرنے کے باوجود بہت ہی مفلوک الحال رہا۔ اس نے بڑی تنگی ترشی کی زندگی بسر کی۔ لیکن میں نے کسی بڑے آدمی کے آستانے پر جبیں سائی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے کبھی ریڈیو پاکستان ڈھاکا کے بتوں کا طواف نہیں کیا۔ اربابِ ریڈیو اگر چاہتے تو اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر اسے کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ انھوں یسا کرنے کی کوشش بھی کی مگر اس وقت جب وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی زندگی کے آخری دو مہینے بڑی تکلیف میں گزرے۔ بیماری کی وجہ سے اضطراب و اذیت کی بنا پر اس نے کتنے ہی شب و روز یک لخت جاگ ار دیئے۔ ان حالات میں اربابِ ریڈیو نے اس کی امداد کے لئے اسے پروگرام دینا شروع کیا۔ ریڈیو والوں کے اس ف خاص کو کیا کہا جائے۔ اس کی وفات سے غالباً ایک ڈیڑھ ماہ قبل ڈھاکا ریڈیو پر ایک مشاعرہ ہوا جس میں اردو عروں سے قاضی نذر الاسلام کی ایک ایک نظم کا منظوم ترجمہ پڑھوایا گیا۔ اور بنگالی شاعروں سے اقبال کی نظموں کے ترجمے

اس موقع پر نذرالاسلام کی جو نظم صادق کو دی گئی۔ وہی دفتر کی غلطی سے ایک پروفیسر صاحب کو بھی بھیجدی گئی۔ جب ایک نظم کے دو ترجمے موصول ہوئے تو ریڈیو والوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ ان کی پریشانی میں پروفیسر صاحب کے اس اعلان سے اور بھی اضافہ ہوگیا کہ اب وہ کسی اور نظم کا ترجمہ نہیں کریں گے۔ آخرکار صادق ہی سے دوسری نظم کا ترجمہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ مالی ضرورت سے مجبور دل و دماغ کی ناگفتہ بہ حالت کے باوجود اس نے دوسری نظم کا ترجمہ کر ڈالا اور میں نے سنا کہ اردو شاعروں میں سب سے کامیاب ترجمہ اسی کا تھا۔ مشاعرے میں پروفیسر صاحب صادق پر یہ احسان جتائے بغیر نہ رہ سکے کہ انھوں نے ریڈیو والوں سے کہا تھا کہ "مشاعرے کے لئے میرا پروگرام منسوخ ہو تو ہو لیکن صادق کو دوسری نظم کے ترجمے کی زحمت نہ دی جائے۔

صادق کی زبوں حالی کے ہاتھوں اس کی خودداری ہمیشہ کشمکش میں مبتلا رہی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے، ایک مرتبہ شہر کے بڑے دولت مند صاحب تجارت نے اپنے یہاں ایک نشست کی۔ اس میں صادق بھی شریک تھا۔ اس وقت تک صادق کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ اور ایک مشہور ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق وہ تپ دق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ بظاہر مدقوق بھی معلوم ہوتا تھا۔ تاہم وہ ملازمت بھی کرتا تھا اور چھوٹے بڑے ہر قسم کے مشاعروں میں شرکت کرتا۔ اس نشست میں صاحب خانہ کو صادق کا نہ صرف کلام پسند آیا بلکہ اس کے حال زار پر رحم بھی آیا۔ چنانچہ نشست کے بعد انھوں نے صادق کے ایک دوست سے جو ان کے دفتری ملازمین میں سے تھا کہا۔ کہ اگر صادق صاحب گوارا کریں تو میں ان کا علاج کرا دیتا۔ جب صادق کو ان کا یہ خیال معلوم ہوا تو میں نے اسے اس فکر میں مبتلا پایا کہ اگر وہ میرے علاج کے لئے واقعی آمادہ ہو جائیں تو مجھے ان کے روپے سے علاج کرانا چاہیئے یا نہیں۔ ایسا کرنے میں میری خودداری مجروح ہوگی یا نہیں۔ چونکہ مجھے اس کی خودداری سے زیادہ اس کی صحت اور اس کی زندگی عزیز تھی اس لئے میں نے اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ تم جن حالات سے گزر رہے ہو ان میں خودداری و رواداری کا سوال اٹھانا بے معنی ہے۔ اگر وہ تمھارا علاج کرانے پر آمادہ ہوں تو ان کی اس پیشکش کو قبول کر لو۔ لیکن چونکہ ان صاحب کی ہمدردی سرتاسر ہنگامی تھی اس لئے بات آئی گئی ہوگئی۔

گذشتہ تین سال کے اندر صادق کے مرض نے کئی مرتبہ ایسی شدت اختیار کی کہ اسے بغیر تنخواہ کے طویل چھٹیاں لینی پڑیں۔ ان چھٹیوں کی بدولت ایک دفعہ اس کی مالی حالت حد درجہ خراب ہوگئی۔ اس نے کئی مرتبہ اشارے کنائے میں مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے علاج کے لئے پبلک سے چندے کی درخواست کروں۔ چونکہ وہ کوئی بہت مشہور شاعر نہ تھا اس لئے مجھے اس درخواست کے کارگر ہونے میں شبہ تھا۔ جب اس کی مالی بے بسی انتہا کو پہنچ گئی تو اس نے صاف لفظوں میں میرے پاس پیغام بھیجا کہ میں اس کے لئے چندے کے ذریعے سے کچھ روپیہ کسی طرح فراہم کروں۔ میں نے اپنے دوستوں، اور صادق کے قدردانوں سے چندہ جمع کرنے کی کوشش کی تو بمشکل ۷۵ روپیہ وصول کر سکا۔ جب میں نے یہ رقم اس کے حوالے کی تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ نظیر! اس وقت اپنا ہی ایک شعر یاد آرہا ہے۔

وقت انسان کو کر دیتا ہے کتنا مجبور
منت غیر اٹھاتا ہوں گوارا نہ سہی

وفات سے چند مہینے قبل جب وہ تپ دق کے علاج کی غرض سے مظفر ڈ ہاسپٹل میں داخل کیا گیا تو اس کی

بڑی اندیشہ ناک تھی - شادانی صاحب اس کی شاعری کے قدر دانوں میں سے ہیں - چنانچہ برابر اس کا حال پوچھتے تھے - ایک مرتبہ میرے ساتھ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے - تقریباً آدھے گھنٹے تک اس کے پاس بیٹھے ایسی رتے رہے جن سے اس کو تسکین و تقویت مل سکے - عیادت کے دو تین دن بعد انھوں نے ازراہ امداد کچھ روپے ہاتھ صادق کو بھیجے - جب میں نے روپے اسے دئے تو اس نے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی - میرے کہنے پر تے روپے رکھ لئے - مالی امداد کا وہ شدت کے ساتھ خواہش مند رہا کرتا تھا - لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے مالی امداد ے خوشی ہرگز نہیں ہوتی تھی - ایسے موقع پر اسے اپنی مجروح خودداری یاد آجاتی تھی - -

ڈھاکے کے اونچے طبقے کے لوگوں میں بیگم حیدر (اسٹیٹ بینک ڈھاکا کے سابق منیجر مسٹر لقمان حیدر کی بیگم) صادق پر ہربان تھیں - وہ شعر و سخن کی بڑی دلدادہ ہیں - ان کے یہاں ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک نشست ضرور منعقد ہی - ان کی تقریباً ہر نشست میں صادق ضرور مدعو ہوتا - یہ اور بات کہ بعض اوقات وہ شریک نہ ہو پاتا - جب پہلی مرتبہ بی اسپتال میں صادق کے داخلے کا سوال پیدا ہوا تو پتا چلا کہ داخلہ بغیر رسوخ یا رشوت کے ممکن نہیں - اس معرکے ی دشواریاں بیگم حیدر ہی کی مدد سے آسان ہوئیں - مجھے یاد ہوتا ہے کہ اسپتال میں صادق کے داخلے سے پہلے بھی کئی ھوں نے کسی نہ کسی حد تک مدد کی تھی - ان کی یہ ساری مدد صادق کی شاعری سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھی - وہ خود بھی شعر کہتی بھی کبھار اپنے اشعار کے متعلق صادق سے مشورہ بھی کر لیتی تھیں - صادق صرف شاعر تھا - استاد نہ تھا - بایں ہمہ بعض نوجوان س نے باقاعدگی کے ساتھ اصلاح بھی لیتے تھے -

صادق مریض اور مفلوک الحال ہونے کے باوجود شادی کرنے سے باز نہ رہا - میں اس کا قائل رہا ہوں کہ جس شخص کو جسمانی اور مالی فراغت نصیب نہ ہو اسے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں - میں نے صادق کو یہ بات سمجھانا چاہی تو وہ یہ عذر پیش تا کہ میں شادی دادا کے اصرار سے کر رہا ہوں - انھیں میرا سہرا دیکھنے کی بڑی تمنا ہے - اس عذر کی صداقت پر یقین ے باوجود میں صادق کو شادی نہ کرنے کی ترغیب دیتا رہا کیونکہ دادے اور دادیاں اپنی تمنا پوری کر کے دنیا سے رخصت ہیں اور اگر رخصت نہ بھی ہوں جب بھی شادی کا خمیازہ شادی کرنے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے - لیکن صادق پر میرے دلائل و نہ چل سکا - اس نے شادی کر لی اور اس طرح اپنی پریشانیوں میں جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھیں اور اضافہ کر لیا - اس کی بیوی ر اور رئیس گھرانے کی لڑکی تھی اس کے والد صادق اور اس کے گھر والوں کے اخلاق سے متاثر ہو گئے اور اس کی مالی کا صحیح اندازہ کرنا بھول گئے - لیکن چونکہ صادق کی بیوی نہایت صابر و شاکر واقع ہوئی تھی اس لئے بڑے ضبط و صبر ھ صادق کے دکھ درد کا ساتھ دے گئی - میں نے صادق کو اس کی رفاقت کا مداح بھی پایا اور اس خیال سے مغموم بھی کہ وہ ی کے لئے کچھ نہ کر سکا - شادی کے دو ہی سال بعد صادق کی بیوی .... دو بچیوں* کو چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی اپنی دونوں بچیوں کو بہت عزیز رکھتا تھا ——— وہ معصوم بچیاں جواب تک یہ سمجھ رہی ہیں کہ ان کا باپ ایک دن واپس آجائے گا -

کہا جاتا ہے کہ شادی کے بعد آدمی اپنے والدین کو بھول جاتا ہے اور اولاد کی پیدائش کے بعد اپنے آپ کو صادق اپنے آپ کو

* ان میں سے ایک کا انتقال ہو چکا ہے - ن - ح

شادی سے پہلے ہی کھول چکا تھا اور اپنے والدین اور بھائی بہنوں کو اولاد کی پیدائش کے بعد بھی نہ بھول سکا۔ بوڑھے اور ماں باپ کا علاج، بہنوں کی شادی، چھوٹے بھائیوں کی تعلیم، ان میں سے ہر ایک کے کپڑے لتے کی فکر، چڑھتے ہوئے قرض بڑھتے ہوئے سود کی ادائیگی، ہر ایک کے جسم و جان کے باہمی تعلق کو برقرار رکھنے کے لئے دال روٹی کا انتظام یہی وہ م تھے جن سے صادق کی زندگی شادی سے پہلے بھی عبارت تھی اور شادی کے بعد بھی۔ انہی مسائل کو حل کرنے کے وہ اپنی بیماری کے سخت سے سخت دورے کے بعد کسی قدر صحت یاب ہوتے ہی دفتر جانے لگتا تھا۔ اِن ہی مسائل تو اسے عافیت کی زندگی بسر کرنے دی اور نہ سکون کی موت مرنے دیا۔

جیسے جیسے صادق کی زندگی کی تلخیاں بڑھتی گئیں۔ اس کی شخصیت طنز میں تبدیل ہوتی گئی ــــ ایک ایسی طنز لفظوں سے زیادہ تبسم میں ظاہر ہوتی تھی۔ جب کبھی اور جہاں کہیں صادق کو مایوسی ہوتی یا مایوسی کا اظہار مقصود ہو وہ ایک خاص انداز سے مسکرانے لگتا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مسکراہٹ میں کتنی چبھن تھی۔

صادق کے مزاج میں مذہبیت خاصی تھی۔ خاندانی ماحول کے اثر سے ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت بھی کر چکا بااین ہمہ نماز روزے کا پابند نہ تھا بلکہ بعض ممنوعہ افعال کی لذتوں سے بھی ناآشنا نہ تھا۔ البتہ وفات سے ایک ڈیڑ سال قبل اس پر مذہبیت بڑی شدت کے ساتھ طاری ہو گئی تھی۔ اس نے پنج وقتہ نماز شروع کر دی تھی۔ کچھ عرصے تک اپنے علاج کے باب میں دوا سے زیادہ ایک مقامی بزرگ کی دعا اور تعویذ پر بھروسا کرنے لگا تھا۔ اس زمانے میں پیغمبروں، ولیوں اور صوفیوں کی زندگی کے حالات و واقعات، ان کے اخلاق و عادات، ان کے معجزوں اور کرامتو تذکرہ بڑی دل چسپی سے پڑھا کرتا اور مجھ سے گفتگو کرتے وقت کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر چھیڑ دیتا۔ وہ ناقابل یقین پر بھی ناقابل شکست یقین رکھتا تھا۔ اس کی باتیں سن کر میں کہیں مسکرا پڑتا تو وہ مجھے مسلمان بننے کی ترغیب دینے لگتا۔ نے مجھے ہمیشہ ملحد سمجھا اور اپنے دلائل سے مجھے مسلمان بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے بارہا کہا کہ نظیر اتم پڑھو اور پیغمبروں اور ولیوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرو تو تمہارے دماغ کو بھی بڑا سکون ملے گا۔ واقعہ یہ ہے اس نے ذہنی سکون ہی کی خاطر مذہب میں پناہ لی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ اگر موجودہ حالات میں مجھے مذ نے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ اسی زمانے سے اس کی مذہبیت اس کی شاعری پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ اس پرکیف تغزل ماند پڑتا گیا۔ اور بے جان تصوف اس کی شاعری پر غالب آتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی نماز کا سلسلہ ٹو گیا۔ پھر بھی اس کی شاعری پر تصوف کا عمل دخل باقی رہ گیا۔ میں نے اس کی شاعری کے اس نئے میلان کی بڑی مخا کی مگر بے سود۔

صادق نے مشاعروں میں شرکت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بعض اوقات وہ ڈھاکے سے باہر کے مشاعروں میں بھی جاتا تھا۔ اپنی مترنم آواز اور اپنے مؤثر کلام کی بنا پر وہ مشاعروں میں بہت مقبول ہوتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ ڈھاکے ایک بڑے مشاعرے میں اسے ہوٹنگ کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس دن مشاعرے کی فضا پہلے ہی سے خراب تھی۔ سام کا ایک حصہ صرف ہوٹنگ کی غرض سے مشاعرے میں آیا تھا۔ صرف ان شعرا کی آبرو محفوظ تھی جن کا ترنم بہت اچھ اس زمانے میں مسلسل علالت کے باعث صادق کے ترنم کی دل کشی کم ہو چلی تھی۔ پھر وہ جس ہیئت اور حلیے میں مائک سامنے آیا وہ شاعر سے زیادہ مریض کی ترجمانی کر رہا تھا۔ ہوٹنگ کرنے والوں کو فقرہ بازی کے لئے مواد مل گیا۔ نتیجتاً

ی غزل ختم کرنے سے پہلے بیٹھ رہا۔

وہ چائے اور پان کا بڑا شائق تھا۔ پان میں تمباکو کھانے کی بھی عادت تھی۔ جو لوگ اس سے اس کے گھر پر ملتے انھیں چائے اور پان ضرور پیش کرتا۔ چونکہ اس کے مرض پر ٹی بی کا شبہ تھا اس لئے بعض احباب۔ اس کے یہاں چائے پینے اور پان کھانے سے پہلو بچاتے۔ لیکن وہ چائے پلانے اور پان کھلانے کے درپے ہو جاتا۔ اس اخلاق یا اخلاقی اصرار کی بنا پر بعضوں نے اس کے یہاں جانا کم کر دیا۔ لیکن یہ بات اسے کس طرح بتائی یا سمجھائی جاتی کہ مریضوں خصوصاً ٹی بی کے مریضوں کا اتنا متواضع ہونا دوسروں کے حق میں مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔

صادق فی الواقع صدق و صفا اور مہر و وفا کا پیکر تھا۔ اس کے خلوص میں آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ حالات نے اسکو ہمدردوں اور دوستوں کی مدد کا محتاج بنا دیا تھا لیکن خود اس کے دل میں اپنے ہمدردوں اور دوستوں کی مدد کا جذبہ پوری قدرت کے ساتھ موجود تھا۔ تنگ دستی نے اس کی انسانیت پرستی اور دوست نوازی کو پورے طور پر ظاہر ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس کے احباب اس کے ساتھ ویسا خلوص نہ برت سکے جیسا خلوص اپنے احباب کے لئے اس کے دل میں تھا۔ یہاں لفظ احباب میں خود میری ذات بھی شامل ہے۔

صادق کا مرض ڈاکٹروں کے لئے ایک مختلف فیہ مسئلہ بنا رہا۔ ایک مدت تک اسے تپ دق میں مبتلا سمجھا گیا۔ بظاہر علامتیں اسی کی تھیں۔ کھانسی ہوتی تھی۔ منھ سے خون آتا تھا۔ حرارت رہا کرتی تھی۔ سانس تیز چلتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ٹی بی اسپتال میں اور ایک مرتبہ ایک عام اسپتال کے ٹی بی سکشن میں داخل کیا گیا لیکن دونوں جگہ طویل تشخیص کے بعد ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ تپ دق نہیں ہے۔ پھر کرونک برون کائٹس اور دمہ تجویز ہوا۔ کلکتے کے ڈاکٹروں کی تشخیص (آخری تشخیص) یہ تھی کہ تپ دق بہت کم ہے البتہ دل بہت بڑھ گیا ہے۔ بہر حال ان میں سے جو مرض بھی رہا ہو اور وہ مرض بجائے خود خطرناک ہو یا نہیں لیکن کلکتے جانے سے پہلے صادق خطرناک حالتوں سے یقیناً گزر رہا تھا۔ وفات سے ایک دو ماہ قبل اس کے جسم کے نچلے حصے میں ورم بھی آ گیا تھا۔ اس علامت کو دیکھ اور سن کر اس کے کئی جاننے والے اس کی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے۔ لیکن میں نے صادق کو اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔ مرض کے شدائد کے باوجود اس کی زبان سے یہ بات کبھی سننے میں نہیں آئی کہ اب شاید ہی بچ سکوں۔ وہ ہمیشہ علاج اور طریق علاج کے متعلق باتیں کرتا، افاقے کا حال بتاتا اور کبھی کبھار اپنے وزن میں اضافے کی خبر سناتا۔ اس نے اپنی صحت یابی کی امید کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ میں کیا بتاؤں کہ اس میں زندہ رہنے کی خواہش کتنی شدید تھی۔ عجیب بات ہے کہ جو لوگ اٹھتے بیٹھتے موت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں انھیں موت نہیں ملتی اور جو لوگ زندگی کے سارے زہر کو پی کر بھی اس سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں ان سے زندگی چھین لی جاتی ہے۔

صادق کی موت کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ جب سے وہ پاکستان آیا ہمیشہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہا۔ لیکن اس کی وفات اپنے تمام اعزہ اور اقربا سے دور کلکتے میں ہوئی جہاں وہ علاج کے لئے گیا ہوا تھا۔ لیکن سچ پوچھئے تو کلکتہ اس کے لئے دیار غیر نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ اس کے جنازے میں تقریباً پانچ سو آدمی شریک تھے۔ ڈھاکے میں یہ شرف وحشت کلکتوی کو بھی نصیب نہ ہو سکا اور اگر صادق یہاں مرتا تو اسے بھی نصیب نہ ہوتا۔ جب وہ ڈھاکے میں صاحب فراش تھا تو بہت سے احباب اس کی عیادت تک کو نہیں جاتے تھے۔ اور آخر آخر تک نہیں گئے۔ یہاں تک وہ ڈھاکے سے کلکتہ اور کلکتے سے وہاں چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ——— !

انتخاب کلام صادق

رباعیات

یہ گردش ایام رہے میں نہ رہوں یہ صبح رہے شام رہے میں نہ رہوں
میں کل کا بھروسا نہیں کرتا ساقی ممکن ہے کہ کل جام رہے میں نہ رہوں

پیمان وفا توڑ دیا ہے تم نے جذبات کا رُخ موڑ دیا ہے تم نے
دینا تھا مرا ساتھ تمھیں منزل تک رستے میں مگر چھوڑ دیا ہے تم نے

قطعات

تھرتھا جس کا تصور اب وہ عالم ہے قریب رات ڈھلتی جا رہی ہے اور گھبراتا ہے دل
لے کے پیغام جدائی آ رہا ہے آفتاب ڈوبتے جاتے ہیں تارے ڈوبتا جاتا ہے دل

بکھری بکھری سی یہ زلفیں، پھیلا پھیلا سایہ کاجل غم سے بوجھل بوجھل پلکیں نیند سے آنکھیں بھاری بھاری
تم کو قسم اپنے صادق کی کچھ نہ چھپانا سچ سچ کہنا اس کی طرح کیا روتے روتے تم نے بھی کل رات گزاری

غم سے کب تک کوئی نباہ کرے میری چھینی ہوئی خوشی دیدو
تم سے ملنے کے قبل تھی جو نصیب مجھ کو واپس وہ زندگی دیدو

بے قراری ہی بن گئی قسمت کوئی بھی صورت قرار نہیں
ان کو اپنا سمجھ کے دیکھ سکوں ہائے اتنا بھی اختیار نہیں

جانتا ہوں تجھے پانے کی ہے تدبیر عبث جانتا ہوں کہ ہے گردش مری تقدیر کے ساتھ
ایک تصویر تصور میں بنا لیتا ہوں اپنی تصویر کو رکھ کر تری تصویر کے ساتھ

غزل کے اشعار

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی اے دوست بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اے دوست
ہمیشہ آتے رہے تغیر، ورق الٹتا رہا زمانہ کبھی فسانہ بنا حقیقت، کبھی حقیقت بنی فسانہ

ہم اپنی روداد کیا سنائیں کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا ہمیں سمجھتے اسے فسانہ

درد دل کا کوئی علاج نہیں
درد دل کی دوا بہت کچھ ہے
اک تبسم کی ہے حقیقت کیا
مگر اس کی سزا بہت کچھ ہے
کوئی شے حسب مدعا نہ ملی
اور تو نے دیا بہت کچھ ہے
ہے بظاہر لبوں پہ مہر سکوت
دل میں ان سے گلا بہت کچھ ہے
کچھ نتیجہ ہو یا نہ ہو لیکن
سوچنے میں مزا بہت کچھ ہے
انھیں آنکھوں سے کیا نہیں دیکھا
اور ابھی دیکھنا بہت کچھ ہے
وہی ہوتا ہے جو خدا چاہے
آدمی سوچتا بہت کچھ ہے
ہم نے بھی کی وفا زمانے سے
سن رہے تھے صلا بہت کچھ ہے
مجھ کو صادق سکون دل نہ ملا
یوں تو نام خدا بہت کچھ ہے

ہر چند غم اُٹھانے کو جی چاہتا نہیں
لیکن انہیں بھلانے کو جی چاہتا نہیں
اب چاہے دل کو پھونک ہی دے شمع آرزو
لیکن اسے بجھانے کو جی چاہتا نہیں
ڈرتا ہوں حال کہتے کہ ہوگا انھیں بھی غم
اور ان سے کچھ چھپانے کو جی چاہتا نہیں

یہ التفات خاص مگر اس کے باوجود
محسوس ہو رہا ہے کہ تم کچھ بدل گئے
اکثر ترے خیال میں کچھ سوچتے ہوئے
جانا کہیں تھا اور کہیں ہم نکل گئے

دہر میں آدمی بسا اوقات
اپنی اوقات بھول جاتا ہے
اپنے دل سے ہے آدمی مجبور
آج بھی کوئی یاد آتا ہے
لاکھ وعدے ہوں لاکھ پیماں ہوں
بھولنے والا بھول جاتا ہے

اب تیری آرزو میں ہے جینے کی آرزو
اک بوجھ بن گئی تھی مری زندگی مجھے
کچھ اس طرح شریک تری انجمن میں ہوں
محسوس ہو رہی ہے خود اپنی کمی مجھے
اچھا ہوا کہ توڑ دیا تم نے دل مرا
اب فکر احتیاط سے فرصت ملی مجھے

تمھیں جب تک نہ دیکھا تھا، گماں تھا
مرے دل میں کوئی ارماں نہیں ہے
بھلانے کی انھیں کوشش کرائے دل
انھیں پانے کا جب امکاں نہیں ہے
عجب یہ دور ہے صادق کہ انساں
سبھی کچھ ہے مگر انساں نہیں ہے

اک شب جو اس نے پوچھا مرے دل کا حال زار
جلتے ہوئے چراغ کو میں نے بجھا دیا
خود کو بہت بلند سمجھنے لگا تھا میں
اچھا ہوا کہ تم نے نظر سے گرا دیا
کھلنے دیا نہ ان پہ کبھی میں نے دل کا حال
جب مل گئی نظر تو نظر سے مسکرا دیا

یہ یاد نہیں تم کو دیکھا ہے کہاں لیکن
آتا ہے خیال ایسا میں نے کہیں دیکھا ہے

ہم سے بدلی جائے گی ہر گام پر روش
ہم کیا کریں زمانے کی رفتار دیکھ کر

اس کی خبر نہیں مجھے کیا چاہتا ہوں میں
بس اتنا جانتا ہوں کہ دل بے قرار ہے

تیرا خط پاکر جو میری کیفیت ہے کچھ نہ پوچھ
ایک اک جملے کو سو سو بار دہراتا ہوں میں

مجھے ان سے رہنا پڑا دور ہو کر
انھیں کی محبت سے مجبور ہو کر

تبسم کو میرے تبسم نہ سمجھو
کہ ہنسنا بھی پڑتا ہے مجبور ہو کر

ہم کیا بتائیں کتنا الم آشنا ہے دل
جب ساز چھیڑتا ہے کوئی کانپتا ہے دل

مانا کہ اس سے بڑھ کے نہیں راہزن مگر
ایسی بھی منزلیں ہیں جہاں رہنما ہے دل

آئی ہے جب بہار تو تم ہو گئے ہو دور
کھلنے لگے ہیں پھول تو مرجھا گیا ہے دل

یہ شمع انجمن، یہ ستارے، یہ مہر و ماہ
دل جب سے بجھ گیا سبھی بے نور ہو گئے

آپ نے مسکرا کے دیکھا تھا
میرے دل نے وہیں سے شہ پائی

سوچتا ہوں کہ دہر میں صادق
میں تماشا ہوں یا تماشائی

یہ تو وہ جانتے ہیں جو ہیں نامراد شوق
آتی ہیں کتنی ظلمتیں اک چاندنی کے ساتھ

کرتے ہیں اکتساب ضیا جس سے مہر و ماہ
ایسا بھی ایک داغ ہمارے جگر میں ہے

دل بجھا یوں کہ زمانے کو خبر تک نہ ہوئی
شمع بجھتی ہے تو محفل میں دھواں ہوتا ہے

جو گزرتی ہے بس گزرتی ہے
کوئی کیا سمجھے کوئی کیا جانے

زندگی پھول بھی ہے کانٹا بھی
جب جسے جس طرح نظر آئے

اس کو جس سانچے میں ڈھالوگے یہ ڈھل جائیگی
زندگی اپنی جگہ خود نہ حقیقت نہ مجاز

انھیں کے جی سے یہ پوچھو جفا کیا ہے وفا کیا ہے
کہ جن کی زندگی گذری جفا سہتے وفا کرتے

تمھارے نام کی شہرت مرے فسانے سے
تمھارے نام سے عظمت مرے فسانے کی

کرتا ہے جب کوئی نشیمن کا تذکرہ
آتا ہے چاروں سمت نظر بس دھواں مجھے

احباب مجھ کو بھول گئے بارہا مگر
صادق کبھی نہ بھولا غریب آسماں مجھے

راہ طلب کو اس قدر آساں نہ جانیئے
صادق بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے

چاند تارے نثار ہوں جس پر
میری دنیا میں ایسی رات کہاں

دنیا کی بات اور ہے، دنیائے عشق میں
صادق طلوع مہر دلیل سحر نہیں

یاد کسی کو کرلیا چپکے سے دل میں رو لیے
اس کے سوا اب اور کیا رہ گیا اختیار میں

ہر قدم پر اب یہی محسوس ہوتا ہے مجھے
جیسے کوئی کہہ رہا ہے تیری منزل دور ہے

بہار آگئی اور گل مسکرائے
مگر جن کو آنا تھا اب تک نہ آئے

محبت کی تشریح ممکن نہیں ہے
محبت سمجھ میں اگر آ بھی جائے

تقدیر کسی کو بھی نہ وہ وقت دکھائے
ہر سانس پہ جب ایک بوجھ ہو اور موت نہ آئے

آئے ہیں زندگی میں وہ لمحات بھی کبھی
جب سوچنا پڑا ہے خدا ہے کبھی یا نہیں

نہ جانے اس پہ بھی کیوں تیری آرزو ہے مجھے یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا

چمن سے جس کی صبح ہو جائے کاش ایسی بھی کوئی رات آئے

اب بگڑ کر بھی دیکھ لیں ان سے شاید اس طرح بات بن آئے

سادگی کہیئے یا اسے قسمت ہم نے اکثر فریب ہی کھائے

برق چمکی تھی روشنی کے لئے لگ گئی آگ آشیانے کو

دیکھیئے رات کیسے کٹتی ہے دن تو گزرا خدا خدا کر کے

یہ تند تند موجیں ، یہ تیز تیز دھارا ڈھونڈو گے تو نہیں ہیں مل جائے گا کنارا

یہ اور بات ہے دن کس طرح کٹے لیکن ترے بغیر گذاری تو زندگی میں نے

ان سے تو کہہ رہا ہوں ساحل ملے گا لیکن طوفان وہ اُٹھا ہے خود میں بھی ڈر رہا ہوں

جھکنا پڑے گا فطرت آدم کے سامنے دامن کوئی ہزار بچائے گناہ سے

اس لئے حال کسی سے نہیں کہتا اپنا کیوں پریشاں ہوں سب ایک پریشان کے ساتھ

یوں تو فصل گل پھر آئے گی مگر جو کلی مرجھا گئی ، مرجھا گئی

غم کا کوئی علاج اگر ہے تو بے حسی اور بے حسی کی جان اگر ہے شراب ہے

صادق ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے بار ہا نعمت ہے زندگی کہ مسلسل عذاب ہے

کبھی کھل کر ہوئی نہ ان سے بات دل میں گھٹ گھٹ کے رہ گئے جذبات

میں تمھیں کچھ بھی دے نہیں سکتا اے مری زیست کے حسیں لمحات

تم جدا ہو گے وہم تک بھی نہ تھا آہ کتنے بدل گئے حالات

سننے والا اگر کوئی ہوتا ہم بھی کہتے کچھ اپنے دل کی بات

تم نہ سمجھے تو کون سمجھے گا میرے جذبات ، میرے محسوسات

مسرت کی تمنا اس لئے صادق نہیں دل میں ضیائے صبح میں پنہاں سواد شام دیکھا ہے

دل کی باتیں ہیں، دل کو بھاتی ہیں اور صادق کی شاعری کیا ہے

یہ کوئی ضروری نہیں میں بھی یہی سمجھوں یہ آپ کو حق ہے مجھے اپنا نہ سمجھیئے

وقت انسان کو کر دیتا ہے کتنا مجبور منت غیر اُٹھاتا ہوں گوارا نہ سہی

میخانے میں ہر ایک نے دیکھا مجھے مگر صادق کسے خبر کہ چلا ہوں پیئے بغیر

ملتا نہیں ہے جب تری قربت میں بھی سکون گھبرا کے سوچتا ہوں کہ کیا چاہتا ہے دل

یوں خوش ہے کھو کے زیست کی دلچسپیاں تمام گویا جو چیز چاہیئے تھی پا گیا ہے دل

وہی خاص و عام کا تفرقہ وہی بیش و کم کا معاملہ میں سمجھ رہا تھا کہ میکدے میں سکوں ملے گا مگر کہاں

غم محبت کو دل نے سمجھا تھا سہل جیسے غم زمانہ مگر اُٹھایا یہ بوجھ میں نے تو جھک گیا زندگی کا شانہ

ہمیشہ آتے رہے تغیر ورق الٹتا رہا زمانہ کبھی فسانہ بنا حقیقت کبھی حقیقت بنی فسانہ

ہم اپنی روداد کیا سنائیں کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا ہمیں سمجھتے اسے فسانہ

نظر ہے مہر و کرم کی مجھ پر لبوں پہ اک طنزیہ تبسم
شکست تسلیم کی ہے اس نے مگر بہ انداز فاتحانہ

کسی کے جانے کے بعد صادق کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے
کہ ایک مرکز پہ جیسے آ کر ٹھہر گئی گردش زمانہ

نہ ہے لبوں پہ تبسم نہ ہے نظر میں پیام
وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے

بے درد سہی، بے مہر سہی، سب کچھ وہ سہی صادق لیکن
جب ان سے نظر مل جاتی ہے بے ساختہ پیار آ جاتا ہے

ہم کہیں تھے دل کہیں تھا، اور نگاہیں تھیں کہیں
ایک سناٹے کا عالم تھا ترے جانے کے بعد

نصیحتیں مجھے کرتی ہے عشق میں دنیا
بہک رہا ہے زمانہ شراب پی میں نے

تم سے بچ کر جو چل رہا ہوں میں
یہ نہ سمجھو کہ بے وفا ہوں میں

ان کو دیکھا تو یہ ہوا محسوس
جیسے مدت سے جانتا ہوں میں

اتفاقاً ذکر جب آیا ترا عالم نہ پوچھ
ہم یہ سمجھے تھے بھلا بیٹھے ہیں تجھ کو دل سے ہم

اہل محفل کی طرح وہ بھی تھے صادق بے نیاز
رنگ محفل دیکھ کر خود اٹھ گئے محفل سے ہم

ہر اک بات ہے عہد رفتہ کی رنگیں
کسے یاد رکھیں، کسے بھول جائیں

اک بہانہ ہے غم چھپانے کا
دل جلوں کی ہنسی ہنسی کیا ہے

دیکھ لیں گے تمہارا وعدہ بھی
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

سچ ہے کہ بہاروں کا سماں ہوتا ہے دلکش
لازم ہے مگر اس کے لئے زندہ دلی بھی

ہر زمانے میں ہر زمانے کا
کوئی شکوہ رہا زمانے کو

پریشاں ہے اک رات میں شمع محفل
یہاں عمر گزری یونہیں جلتے جلتے

آگے بڑھتا جا رہا ہوں دل پہ کس کو اختیار
ورنہ میں بھی جانتا ہوں جو مرا انجام ہے

سمجھتے ناز کہاں تک ترے تغافل کو
خطا معاف کہ ہم بھی ہیں آدمی اے دوست

کوئی زمانے میں رہتا نہیں خوشی سے اداس
بس اور کیا کہوں وجہ فسردگی اے دوست

محبت نے تری مجھ کو سنبھالا
نہیں تو ہے ہی ڈوبی تھی جوانی

اے دوست زندگی میں ہوتا ہے فرق کتنا
تم جام بھر رہے ہو میں آہ بھر رہا ہوں

موت آتی ہے ایک بار مگر
اس سے پہلے بھی لوگ مرتے ہیں

کاش قوت بھی اس قدر ہوتی
دل میں جتنی ہے حسرت پرواز

دہر میں آدمی لبا اوقات
اپنی اوقات بھول جاتا ہے

جہاں تک جو پہنچے وہی اسکی منزل
کوئی عشق کی خاص منزل نہیں ہے

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ
علی شیر خاں - محلہ کھترانہ کلاں - رائے بریلی - یو۔پی

ترکی ادب کا پسِ منظر

...صابر

...سے قبل کہ ترکی ادب پر کچھ لکھا جائے۔ ترکی قوم ترکی زبان اور ترکی داستان وغیرہ پر روشنی ڈالنا ضروری ہے ۔

...ب ترکی کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے ۔ چنانچہ کہیں انھیں ہون (HUN) اور کہیں کشاں (KUSHAN) کہا گیا ہے ۔
...ن کتب میں انھیں یوچی (YUCHI) کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے ۔ چینی تواریخ میں ترکوں کے لئے ہیانگ نو ... (TUKIYU)° کے الفاظ موجود ہیں ۔ بعض حضرات کو لفظ توکیو سے غلط فہمی پیدا ہوئی اور انھوں نے اسے ... (TOK...) سمجھ کر جاپانیوں کو بھی قدیم ترکی قوم خیال کیا ہے ۔ ہندوؤں نے قبل الاسلام ترکوں کو عام طور سے ترشکا ... (TUR...) کہا ہے ۔ غرضیکہ یہ عجیب و غریب اور بہادر قوم بہت سے ناموں سے نوازی گئی ۔
...ی طور پر لفظ ترک[1] آٹھویں صدی عیسوی کے ترکی کتبوں میں تقریباً ۹۰ بار استعمال ہوا ہے اس دور کا نام ...ہے اور اس کا آغاز چھٹویں عیسوی سے ہوتا ہے ۔
...ی قوم کی زبر دست خصوصیت سلطنتوں کا قائم کرنا ہے ۔ اسلام سے قبل اور اس کے بعد ترکوں نے زبردست ...م کیں ۔ اسلامی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والے کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ غزنوی خوارزم شاہی سلجوقی ...ری عثمانی صفوی اتابیگی اور مغلیہ یا بابری سلطنتیں اصل کے اعتبار سے خالص ترکی تھیں ۔

...ن ترک اپنی زبان کو ترک تیلی (TÜRKTİLİ) یا ترک دلی (استانبولی لہجے میں) کہتے ہیں ۔ لیکن عام طور سے ترکچہ[2] (TÜRKG) کہتے ہیں ۔ کبھی کبھی " ترکی " یا " ترکی لسانی " (لسان ترک) بھی ...

...ی کا تعلق نہ تو عبرانی اور عربی جیسی سامی زبانوں سے ہے اور نہ سنسکرت فارسی یا پشتو جیسی آریائی زبانوں سے ہے۔ ...ق تورانی یا " یورال ۔ آلتائی " (URAL-ALTAIC) خاندان سے ہے اور یہ بذات خود ایک قدیم اور مستقل زبان

...ے ترکی اب لفظ ترک کو " تورک " (TÜRK) لکھتی ہے ۔

...ترکی ہو، چند قابل غور علامات یہ ہیں C = ج   Ç = چ   Ş = ش

ہے۔ منچوری تن لینڈذی ہنگاری وغیرہ ترکی کی قرابت دار زبانیں ہیں اور شاید منگولی بہ نسبت دیگر آلتائی زبانوں کے
سے بہت قریب ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ترکی اور منگولی ایک ہی زبان ہیں۔ آج کل یہ زبان تقر
دس کروڑ انسانوں کی زبان ہے جو ایڈریاٹک سے یوگوسلاویہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس زبان کو
ممالک میں قومی زبان ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس وقت تقریباً ۲۷ اہم لہجے اس زبان کے ہیں۔ ترکوں کا ا
خزانہ نہایت مالدار ہے۔

ترکی بولنے والے بعض قبائل اب بھی بت پرست یا برائے نام عیسائی ہیں۔ مثلاً رومانیہ کے غاغاوس (AVUS
اور سائبیریا کے یاقوت (YAKUT) لیکن ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ باقی سارے ترکی قبائل عام طور پر حنفی
کے پیرو ہیں۔ قواعد کے لحاظ سے ترکی ایک سیدھی سادی زبان ہے اور اُردو و نیز فارسی دان حضرات کے لئے نہایت ہی آ

(۱)۔ اورخونی دور ۵۵۲ء تا ۷۴۵ء

ترکوں کا سب سے قدیم ادبی سرمایہ یا خزانہ منگولیا کے اور
(اورخون) (ORKHUN) نامی دریا کے قرب وجوار میں پتھروں
مزاروں کی شکل میں برآمد ہوا جسے انیسویں صدی میں حل کر کے دیگر زبانوں میں ترجمے کے ساتھ پیش کیا گیا۔ آشنا (HINA
نامی ترکی گروہ کے لیڈر تومن خاں (TÜMEN) نے (جسے چینی یومن کہتے ہیں) اپنے مخالفین کو نیچا دکھا کر اور تمام
قبائل کو ایک متی وحدت کی لڑی میں پرو کر ۵۵۲ء میں پہلی عظیم الشان ترکی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ان ترکوں کو کوک
(KÖK-TÜRK) بمعنی "آسمانی ترک" کے نام سے یاد کرنے کے باعث ان کی زبان کو بھی "کوک ترکی" کہتے ہیں
کے ساتھ ساتھ اس دور کی زبان اور رسم الخط کو بھی "اورخون" کہتے ہیں۔ جو دراصل دریا کا نام ہے جس کے ارد گرد یہ
کتبے پائے گئے ہیں۔ ترکوں کا سیاسی وادبی مرکز وسط ایشیا یا ترکستان نہیں بلکہ منگولیا تھا کیونکہ تومن خاں نے کامیابی کے
پہلا کام مرکز کی تبدیلی کا کیا۔ مرکز کو جنوب سے ہٹا کر شمال کی طرف لے جانا سیاسی مصلحت کے پیش نظر تھا۔ افسوس کہ آج اس
میں ادبی سرگرمی کا نام ونشان بھی نہیں حالانکہ صدہا سال تک یہی علاقہ ترکی تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔ جس وقت
منگولیا میں حکومت کرتے تھے منگول قوم ان سے بہت دور اور شمال میں رہتی تھی۔

ترکوں کو اس دور میں چین اور ایران سے زبردست خطرات درپیش تھے اور ایران کو بازنطینی سلطنت سے جو
کو افریقہ اور مشرق وسطیٰ سے نکالنے کی فکر میں تھی۔ چنانچہ ترکوں نے ۵۶۰ء میں قسطنطنیہ ایلچی بھیجکر ایران کے خلاف فوجی
کا منصوبہ بنایا۔ اس کے پیش نظر ۵۶۸ء میں ترکوں کے مرکز حکومت میں قیصر روم کا نمایندہ زمارخ (MARAKH
وارد ہوا جس کا شاندار استقبال خاقان کے بھائی استیمی (İSTEMİ) نے کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں میں
سوجھ بوجھ کہاں تک تھی۔

۵۷۰ء میں جب ظالم ابراہہ نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ کیا تو ترکوں نے ایرانی علاقوں کو دبا لیا اور چن
کے عرصہ میں ان کی سرحدات کوہ قاف تک پہنچ گئیں۔ ریشم کی تجارت کا جو راستہ تھا وہ اب ترکوں کے قبضے میں آگیا۔

اس سلطنت کے آخری خاقان بیلگہ خاقان (BİLGE) اور اس کے بھائی کول تگین (ULTEKİN
بمعنی "ہنس مکھ شاہزادہ" تھے جن کے مزار ۷۳۲ء اور ۷۳۴ء میں تیار ہوئے۔ ان مزاروں پر جو خطبات کندہ ہیں
چینی ترجمے بھی موجود ہیں۔ چنانچہ سیاسی نوعیت کے یہی دردناک خطبات ترکی کے ادب کے قدیم ترین انمول نمونے

ی مصطفیٰ کمال پاشا کے خطبات بھی اورخونی خطبات کے طرز پر ہیں - ظاہر ہے کہ یہ خطبات اتا ترک سے بہت قبل ہی ترکی میں ے ہوگئے تھے - اس دور میں ترکی زبان دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھی جس کو " اورخون بازی سی " کہتے تھے - یہ رسم الخط حروف کے لکھنے کے لئے بے مثل طرز تحریر تھی اور بذات خود ترکوں کی ایجاد تھی -

ان کتبوں کی لسانی مذہبی اور سماجی اہمیت بھی کافی ہے - ان خطبات میں لفظ ترک تقریباً ۹ بار استعمال ہوا ہے سے ترکوں کی قومی حس کا پتہ چلتا ہے - ترک اور ترکیت کو قبائل اور قبائلی تعصب پر ترجیح دے کر آسمانی ترکوں نے ست قومی اتحاد پیدا کیا - کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ترک تو خداؤں کو مانتے تھے - ایک تو زمین کا خدا اور دوسرا آسمان کا -

خدا اور ترکیت کے خیالات مندرجہ ذیل کلمات سے بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں :-

" تورک تنگری سی تورک آتی یوق بولمازون " (TÜRK TENGRİSİ ، TURK ATI، YOQ BOLMAZUN)

بہ :- اے ترکوں کے خدا ترکوں کا نام ناپید نہ ہو (نہ ہونے پائے)

اس دور کے آخر میں ہندوستان سے نووارد مذہب بدھ مت کا اثر پڑنے لگا - حالانکہ بیلگہ خان کے وزیر اعظم و قوق (TONGYOQUQ) نے مشورہ دیا تھا کہ بدھ مت کو ترکوں میں نہ پھیلنے دیا جائے - لیکن اس پر عمل درآمد ہو سکا اور ترک بدھ مت کے عقیدۂ نروان میں مستغرق ہوگئے - بودھی ترکوں کے عہد میں ترکیت کا لبادہ چاک چاک گیا - یہ عہد " اویغوری دور " کے نام سے مشہور ہے - بدھ مت کا اثر تقریباً ۵۰۰ سال تک رہا - بنوامیہ کے یں ترکوں کی اکثریت ترکستان میں اسی مذہب کی پیرو تھی -

دور اویغوری (۷۴۵ء تا ۸۴۰ء)

۶۰۶ء میں آسمانی ترکوں کی سلطنت میں اویغور نامی تاکی قبیلہ بھی شامل تھا جس نے ۷۴۵ء میں باس مل (BASMIL) و دھڑ دشمن قرلوق (QARLUQ) ترکوں کے ساتھ ساز باز کر کے آسمانی ترکوں پر حملے کئے - اور اس سلطنت کی اینٹ اینٹ بجا دی - اویغور (UYGHUR) سلطنت کا مرکز بھی آسمانی ترکوں کی طرح منگولیا ہی رہا -

عرصۂ دراز تک منگولیا ترکی دنیا میں شمع علم روشن کرتا رہا -

حالانکہ اویغوری دور کے ترک قدیم ترکی مذہب (جو شامان ازم سے جدا تھا) کے ساتھ ساتھ شامان ازم مزدکیت یہودیت یسائیت جیسے مذاہب کے بھی پیرو تھے لیکن اب اکثریت نے بخوشی بدھ مت کو قبول کر لیا تھا - آسمانی ترکوں نے اپنی سلطنت رک " کہا تھا لیکن اس کے برعکس اویغوروں نے اس کا نام (اون - اویغور توقوز اوغوز) (ON UYGHUR-TOQUZ OGHUZ) دس اویغور نو اوغوروں " کی حکومت رکھا -

آسمانی ترکوں کے دور میں رسم الخط صرف ایک تھا - اویغوری دور میں مانی سنسکرت اور اویغوری رسم الخط کو عروج ہوا بت کے باعث مانی رسم الخط کا اثر ہوا اور بدھ ازم کے باعث برہمنی رسم الخط (سنسکرت) اور ہندوستانی الفاظ کا نفوذ - اویغوری ترکی میں صدہا الفاظ سنسکرت کے ہیں اور سنسکرت رسم الخط سالہا سال تک ترکی لکھنے کے لئے بعض ں میں مستعمل تھا - اس رسم الخط میں کافی کتابیں برلن لائبریری میں موجود ہیں -

ترکوں نے اس دور میں اہل صغد سے ایک رسم الخط سیکھا جو پورے ترکی دنیا کا مشترک و واحد رسم الخط بن گیا - اس کا نام ور یازی سی " ہے جس کا رواج بابر کے زمانے تک رہا - یہ بھی عربی کی طرح دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھی -

اس دور میں سنسکرت اور چینی سے ترجمے کافی ہوئے - جگہ جگہ گوتم بدھ کے مجسمے نصب کئے گئے اور مٹھوں کی تعمیر
سلسلہ شروع ہوا - ترکوں نے ابتلا اور اوغوز خان بننے کے بجائے بھکشو بننے کی تحریک چلائی - ترکی دنیا نروان کے چکر میں
۵۰۰ سال تک سرگرداں رہی - بدھ ازم کا اثر ترکی ادب پر بہت زیادہ ہوا - اس دور کی کتب پر مندرجہ ذیل کلمات تحری

(۱) "نامو بت نامو دہرم نامو سنگھہ" (NAMO BUT, NAMO DARAM, NAMO SANG)

ترجمہ :- تعریف و احترام بدھ کی اس کے مذہب کی اس کی جماعت کی -

اویغوری سلطنت کا خاتمہ ۸۴۰ء میں شمال میں بسنے والے قرغز (QIRGHIZ) نامی ترکی قبیلے نے کیا
اس کے بعد اسلامی ادب کا دور شروع ہوتا ہے جو نہایت ہی شاندار ہے - اسلامی دور میں ترکی ادب اپنے نقطۂ عرو
کو پہنچ گیا -

اسلامی ترکی ادب

اسلام نے ترکوں کو بہت شرف بخشا اور ان کی ادبی اور ملی ترقیوں کو بام عروج تک پہنچا دیا
نویں صدی عیسوی میں سب سے پہلی ترکی اسلامی حکومت کاشغر میں قائم ہوئی جو آج کل سرخ چ
کے قبضہ میں ہے - اس کا نام قرہ خانلیغ (QARA KHANLIGH) تھا - اس دور میں ترکوں نے فوج در فوج اس
قبول کرنا شروع کیا - اس وقت کی ترکی زبان کو قرہ خانی بھی کہتے تھے - اویغور رسم الخط کے ساتھ ساتھ عربی رسم الخط
رائج تھا - قرہ خانی دور کی دو اہم کتابیں یہ ہیں :-

۱- قوتادغو بیلیگ

(QUTADGHUBILIG) بمعنی "سعادت بخش علم"

یوسف خاص حاجب نے کاشغر میں ۱۰۶۹ء میں لکھ کر مسلم اویغور فرمانروا بوغرا قرا خان
ابو علی حسن بن سلیمان کی خدمت میں پیش کیا - اس کے تین نسخے انیسویں صدی میں برآمد ہوئے[۱] - یہ مسلم ترکوں کی وا
قدیم منظوم اخلاقی کتاب ہے جو شاہنامہ کے وزن پر لکھی گئی ہے - اس دور کے ترک سارا کام "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ک
کر کرتے تھے اس لئے کتابوں پر بھی یہی تحریر ہے - اویغور دور میں گوتم بدھ کا نام ورد زبان تھا تو اس دور میں اللہ او
حضرت محمد کا - اس کتاب میں ترکوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ نیک کام کریں اور گوتم بدھ کے مجسموں اور مٹھوں کو تباہ و بر
کر دیں - اس سے پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی میں بدھ مت اور دین اسلام میں شدید کشمکش جاری تھی -

۲- دیوان لغات الترک

(ترکی لہجوں کی لغت)

جس وقت یوسف خاص حاجب کاشغر میں اپنی کتاب لکھ رہے تھے مشہور ترک
عالم محمود بن الحسین بن محمد الکاشغری ترکی دنیا کی سیاحت میں مصروف تھے - آپ نے تمام ترکی لہجوں کے نمونے جمع

۱؎ ترکی زبان میں چونکہ دھ اور گھ تھ بھ وغیرہ کی آواز نہیں ہوتی اس لئے میں نے لاطینی میں صحیح تلفظ دیدیا ہے او
ہندو پاکستان کے تلفظ کے مطابق عربی رسم الخط میں لکھا ہے -

۲؎ اس کتاب کو استانبول یونیورسٹی کے ماہر ترکیات پروفیسر رشید رحمتی آرات نے لاطینی حروف میں ترتیب دے کر .T.D.K
(ترکی زبان کی انجمن) انقرہ سے شائع کیا اور اسے جدید ترکی میں ترجمہ بھی کیا - لسانیات کی رو سے نہایت
اہم کتاب ہے -

کے عربی کے مقابلے پر ایک بے نظیر اور پہلی ترکی عربی لغت تیار کی جس کا مقصد ترکوں کی اہمیت سے دنیا کو روشناس کرانا اور عربوں کو ترکی سکھانا تھا[۵]۔

یہ کتاب سنہ ۱۰۷۲ء میں بغداد میں لکھی گئی اور ۲۷ویں عباسی خلیفہ المقتدی بامراللہ ابوالعباس عبداللہ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس میں بہت سے منظوم ضرب المثل جمع کئے گئے ہیں۔ اس کی لسانی اہمیت زیادہ ہے۔ اس میں بھی ترکوں سے کہا گیا ہے کہ وہ بدھ مت کو تباہ کر دیں۔

دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

"ہم چڑیوں کی طرح اُڑے
سمندر کی طرح بہے
گوتم بدھ کے سر پر گندگی ڈالی
اس کے مکان کو مسمار کر دیا"

باوجود اس کے کہ مسلم اویغوروں نے ترکی دنیا سے بدھ مت کا خاتمہ کر دیا اس مذہب کے اثرات آج بھی ترکوں پر ہیں۔ وسط ایشیا سے جو صوفی تحریکیں اُٹھیں ان پر بھی کم و بیش بدھ خیالات کا اثر تھا جیسے احمد یسوی اور مولانا رومی کی تحریکیں۔ غرضیکہ ترکوں کے ابتدائی ادبی نمونے بھی تھے۔ اس کے بعد کا دور نہایت ہی تابناک ہے جبکہ ترکی ادب تین اہم ادبی حلقوں میں بٹ گیا۔

۱- چاغتائی ترکی ادب

(اسے شرقی ترکی ادب بھی کہتے ہیں) مشہور شعراء مولانا لطفی علی شیر نوائی بادشاہ بابر وغیرہ ہیں اس لہجے کی جگہ جدید ازبکی زبان نے لے لی ہے جو نہایت ہی شیریں اور ترقی یافتہ ترکی سمجھی جاتی ہے۔ جدید ادبی مرکز تاشکند ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء سے روس کے سارے ترکی لہجوں کے لئے روسی رسم الخط جاری کر دیا گیا ہے۔

۲- عثمانلی یا اناطولی ترکی ادب

(اسے مغربی ترکی ادب بھی کہتے ہیں) مشہور شعرا مولانا جلال الدین رومی۔ سلطان ولد بن مولانا روم یونس امرہ قاضی برہان الدین شیخ غالب باقی ندیم عبدالحق حامد اور محمد عاکف وغیرہ ہیں۔ اس لہجے کی جگہ سنہ ۱۹۰۸ء سے جدید ترکی زبان نے لے لی ہے جس کے لئے عربی کے بجائے لاطینی حروف اتاترک نے سنہ ۱۹۲۸ء میں جاری کئے۔ جدید ترکی استانبول کی خواتین کی ترکی ہے جو تمام ترکی لہجوں میں سب سے زیادہ میٹھی اور مترقی سمجھی جاتی ہے۔

۳- آذری ترکی ادب

اس کا بھی شمار مغربی ترکی یا اوغوز (OGHUZ) ترکی میں ہے۔ اس لہجے کے مراکز تبریز اور شہر باکو (روس آذربائجان) ہیں۔ ایران کے آذری ترک اپنی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھتے ہیں اور روس والے سنہ ۱۹۴۰ء سے روسی حروف کا استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے مشہور شعرا حسن اوغلو شاہ اسمٰعیل صفوی اور فضولی بغدادی ہیں۔ اس کی جگہ جدید آذری نے لے لی ہے جو جدید ترکی کے قریب ہے۔

---

[۵] یہ کتاب عربی متن کے ساتھ بھی استانبول سے شائع کی گئی ہے۔ پروفیسر BESIM ATALAY صاحب نے جدید ترکی میں اس کا چربہ تیار کیا اور ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اہم لغت ہے۔

لکھنؤ میں اردو

سیّد محمد باقر شمس لکھنوی۔ کراچی

ہر خطۂ زمین کے باشندے صورت شکل، طبیعت، مزاج ذوق اور معاشرت میں مختلف ہوتے ہیں۔ کشمیر کے رہنے وا۔ قاف کے باشندے۔ جبش کے بسنے والے منگولیا کے ساکن یورپ کے انگریز ایک دوسرے بالکل الگ ہیں۔ اسی طرح اس برصغیر کے مختلف حصّوں کے آدمی مدراسی، بنگالی۔ بہاری۔ پنجابی۔ سرحدی، سندھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ یو۔ پی کے رہنے والے ان سب سے علیحدہ اور یوپی میں اودھ کے باشندے اور اودھ میں لکھنؤ کے رہنے والے سب سے الگ نظر آتے ہیں وہ اپنی وضع قطع اور بات چیت سے فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔ ان کی نفاست طبع۔ نزاکت مزاج حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کے ہزاروں قصے مشہور ہیں، ان کے اتنے ذہین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کی آخری حد لکھنؤ ہے یہاں کے لوگوں کو حکمت یونان تہذیب ایران فصاحت عرب اور فلسفہ ہند نے ہزاروں برس اپنی گود میں پالا ہے اس کی تاریخ ان سے وابستہ ہے۔ جس کو اجمالاً ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

لکھنؤ کا جغرافیہ ہر جگہ کے علمی، تمدنی اور سیاسی حالات کے وجود میں آنے کا بڑا سبب وہاں کا جغرافیہ ہوتا ہے اودھ کا علاقہ جو کسی زمانے میں قنوج سے بہار تک پھیلا بنارس۔ غازی پور، گورکھپور۔ بستی۔ بلیا۔ بہرائچ گونڈہ سیتاپور، سہارنپور، ہردوئی، الہ آباد۔ مرزاپور سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے قلب میں لکھنؤ آباد ہے۔ یہ خطہ دوآبے کا علاقہ کہلاتا ہے جو اپنی زرخیزی میں ہندوستان کا باغ اور مردم خیزی میں دماغ ہے۔

دریا گنگا جمنا کی جولانگاہ یہی ہے گھاگھرا یہیں مست خرام ہے گومتی اور سئی یہیں کروٹیں لیتی ہے۔

صحرا و دشت یہاں کے جنگل میں شیر سے لے کر بٹیر تک ہر قسم کا جانور موجود ہے نہ کہیں ریگستان ہے نہ پہاڑی سلسلہ بنجر زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نہ ہونے کے برابر ہیں تمام زمین زرعی ہے ہر قسم کا اناج اور بہترین قسم کے پھل قدرت نے اس کو عطا کئے ہیں۔

موسم نہ گرمیوں میں آگ برستی ہے نہ جاڑوں میں برف پڑتی ہے۔ برسات بہار اپنے ساتھ لاتی ہے۔ در و دیوار پر سبزہ اُگ آتا ہے دن کو پھولوں کی پتیاں رات کو آگ کی چنگاریاں ہوا میں پرواز کرتی ہیں۔ کالی گھٹا جھوم کے آتی ہے بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج میں کبھی اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ کبھی زور کی بارش کے بعد گھٹا کے پردے کو چاک کرکے سورج جھانکتا ہے اور پھر بادل آڑ میں چھپ جاتا ہے۔ کبھی دونگڑا۔ کبھی جھالا۔ برستا ہے کبھی پھوہار پڑتی ہے

وسلا دھار پانی گرتا ہے کبھی جھڑی لگتی ہے۔ کبھی پانی برس کے نکل جاتا ہے اور دھوپ کے ساتھ قوس قزح نکل آتی ہے، ں میں تاحد نظر سبزہ لہلہاتا ہے دریا جوش مارتے ہیں تالاب ابل جاتے ہیں۔ قاز، سرخاب، بگلے اور سارس غول کے غول پانی تے ہیں، کوئل کی کوک پپیہے کی ہوک دل میں تیر و نشتر بن کے اتر جاتی ہے مور مست ہو کے ناچتا ہے: انسانوں کو بھی موسم تا ہے باغوں میں جھولوں کے ملبے پینگ اور اونچے گیتوں کی لمبی تانیں کیف و مستی کی غمازی کرتی ہیں۔ عورتیں راستوں بادن اور کجلی گاتی پھرتی ہیں۔ قدرت کی فیاضی شہد کے ستر بھر گلاس آسمان سے برسا کے سامان کیف میں اضافہ کر دیتی ں شہر سے لے کے دیہات تک زندگی کو بہار گود میں اٹھا لیتی ہے۔

و کی علمی تاریخ

یہی وہ دلفریبیاں ہیں جنھوں نے طاقتور لوگوں کو اپنا بستر بچھانے کے لئے بلایا۔ جہاں حکمراں اپنا مستقر بناتے ہیں وہیں اہل کمال اپنا گھر بناتے ہیں کیونکہ وہ انکے اور یہ ان کے بغیر زندہ نہیں ے اسوجہ سے یہ خطہ مردم خیز بھی بن گیا۔ کورو پانڈو کی لڑائی (مہابھارت) اسی زمین پر ہوئی رام راج کا مرکز یہی علاقہ بنا ارت کے باکمال شاعر یہیں پیدا ہوئے، ہندی کے بڑے بڑے شاعر اسی خاک سے اٹھے۔ ایشور کے مقدس اوتار مین پر اترے بڑے بڑے سورما اسی خاک سے پیدا ہوئے رشیوں اور منیوں کے استھان یہیں بنے علوم و فنون اور یب و تمدن کے مرکز یہیں قائم ہوئے، رفتہ رفتہ یہ پورا علاقہ خانقاہوں۔ عبادت خانوں اور درسگاہوں سے بھر گیا خاص مرکز بہرائچ۔ اجودھیا، دریا نگر۔ کاشی اور پراگ تھے۔

راجہ جدھشٹر کے بیٹے راجہ جنم جی نے اس پورے علاقہ کو رشیوں اور منیوں کی جاگیر میں دیدیا اس طرح یہ پورا علاقہ علم و تہذیب و تمدن اور ادب و شاعری کا ہزاروں برس سے مرکز ہے۔ کاشی کی علمی و تمدنی مرکزیت آج بھی باقی ہے ھیا اور پراگ بھی زندہ ہیں۔

ر اسلام

جزیرہ نمائے عرب میں، ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا ان کی وفات کے بعد ان کی تعلیم اور تنظیم کا رخ ملک گیری کی طرف مڑ گیا اور مسلمانوں کی گھوڑوں کی ٹاپوں سے سینۂ گیتی دہلنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ رومن امپائر اور ایرانی شہنشاہیت پر قابض ہو گئے۔ ان کے قدم آگے ہی بڑھتے گئے، ترکستان اور منگولیا پر چھا جانے ـدان کے گھوڑے اٹک کو پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوئے اور کوئی ان کی لگام نہ پکڑ سکا۔ وہ خلیج بنگال تک طوفان رح بڑھتے چلے گئے۔ ان کے پیچھے اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے لشکر بھی یلغار کرتے ہوئے داخل ہوئے ی ابتدائی منزلیں ملتان۔ بھکر اور لاہور تھیں لیکن بعد کو ان کے قدم آگے بڑھے اور اودھ میں مراکز قائم ہوئے۔

ویں صدی ہجری

دریا نگر (شہر علم) جو مون (خاموش) پجاریوں کا اور الہیات کا بہت بڑا مرکز تھا اس کو سید نجم الدین نے جو امام علی نقی" کی چھٹی پشت میں تھے فتح کیا اور اس کا نام جائے عیش رکھا ـرت استعمال سے جائس ہو گیا۔ سید نجم الدین اور ان کے بیٹے سید شمس الدین بڑے صاحب علم و فضل تھے ان کی ویں باکمال علماء پیدا ہوئے جن سے جائس علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ ابو الحسنات ندوی کا بیان ہے۔

" دیوا، جائس۔ گوپامئو۔ خیر آباد اور بلگرام ....

اپنے اپنے علماء کے فیض وجود سے بجائے خود کالج یا یونیورسٹی تھے۔"

ہندوستان کی قدیم درسگاہیں

یہ سب اودھ کے قصبے ہیں۔ جائس وہی مقام ہے جس نے فرنگی محل ایسے مرکز علم کو پیدا کیا ابو الحسنات ندوی لکھتے ہیں

"ملا قطب الدین سہالوی کے نامور فرزند ملا نظام الدین کے فیض نے فرنگی محل کو ہندوستان کا دار العلم بنایا یہ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے وقت چودہ برس کے تھے شرح ملا جامی تک تعلیم ہوئی تھی بقیہ کتابیں ملا علی قلی جائسی اور مولانا نقش بند گوراکھپوری سے پڑھیں۔"

ہندوستان کی قدیم درس گاہیں ص۳۷

ملا نقش بند نے لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی اور وہیں قیام کر لیا تھا۔ ملا نظام الدین نے ان سے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔

جس زمانے میں سید نجم الدین نے ودیا نگر کو مسخر کیا اسی زمانہ میں سید سالار مسعود غازی نے بہرایچ پر حملہ کیا جب وہ کام آئے مگران کی قبر اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے سال میں ایک دفعہ وہاں زبردست میلہ لگتا ہے دور دور سے لوگ جاتے ہیں۔

چھٹی صدی ہجری

چھٹی صدی ہجری میں اودھ کو اتنی مرکزیت حاصل تھی کہ تاریخ میں شیخ الاسلام مولانا فرید الدین شافعی کی درس گاہ میں علماء کا انبوہ کثیر نظر آتا ہے۔ صاحب سیر الاولیا کا بیان ہے کہ

در مجلس درس مولانا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود قاری کشاف خدمت مولانا علاء الدین نیلی بود و خدمت مولانا شمس الدین و علمائے اودھ سامع بودند ص۲۷۵

ان علمائے اودھ میں تین بزرگوں نے عظیم شہرت حاصل کی۔

(۱) شیخ علاء الدین نیلی اودھی (۲) شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰی اودھی (۳) شیخ نصیر الدین محمود اودھی۔ یہ نصیر الدین محمود وہی ہیں جنھوں نے دہلی جا کے علم و فضل کی اتنی روشنی پھیلائی کہ آج تک چراغ دہلی کے نام سے مشہور ہیں ان علمائے اودھ کے علمی درجے کے متعلق ضیائے برنی

ان میں کا ہر ایک ایسا استاد اور علامہ وقت تھا کہ سمرقند مصر اور ربع مسکون میں اس کا جواب نہ تھا۔

تاریخ فیروز شاہی

ساتویں صدی ہجری

ساتویں صدی ہجری کے آواخر میں سید محمد صغریٰ بلگرام تشریف لائے یہ زید شہید امام زین العابدینؑ کی اولاد میں تھے انھیں کے اخلاف سے بلگرام اسلامی علوم

اسی زمانے میں خاں جہاں اودھ کا صوبہ دار ہوا یہ علم و فن کا بڑا قدر دان تھا اس کے ساتھ بہت سے اہل کمال اودھ میں آئے امیر خسرو اس وقت اسی کے دربار سے وابستہ تھے وہ بھی اس کے ساتھ آئے اور دو برس تک یہاں اور بہت خوش رہے۔ خود قران السعدین میں لکھتے ہیں ؎

خاں جہاں حاتم مفلس نواز | گشت با قطاع اودھ سرفراز
در اودھ از بخشش او تا دو سال | ہیچ غم و نالہ نہ بود از مثال

اس وقت لکھنؤ کو اتنی علمی مرکزیت حاصل تھی کہ سمرقند سے ایک پیر طریقت نے یہاں آکے قیام کیا وہ اس پایہ کے بزرگ تھے کہ شیخ ضیاء الدین کرمان سے ان کی ملاقات کو آئے اور یہیں کے ہو رہے اور ان کی نسل سے بڑے بڑے متبحر علماء ہوئے جن کے سلسلے کی درسگاہیں صدیوں قائم رہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم علمی مقام تھا ورنہ گمنام جگہ اہل علم کا دور دراز ملکوں سے آکے بسنا ممکن نہیں۔

…ں صدی ہجری

آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری کے خلیفہ شیخ قوام الدین لکھنؤ آئے اور یہیں انتقال ہوا۔ ان کے علاوہ جن علمائے اودھ نے شہرت حاصل کی وہ مولانا بدر الدین …ر الدین، مولانا تاج الدین، شیخ دانیال سرکھ شیخ مبارک اور شیخ معروف ہیں۔

…صدی ہجری

قاضی سماء الدین جن کا نام ابھی آپ سن چکے ہیں یہ لکھنؤ کے ایک علمی سلسلے کے بانی ہیں ان کی اولاد میں شیخ سعد اللہ فرازکند دری متوفی سنہ ۹۲۹ھ کے دو بیٹے شیخ محمد امین اور شیخ سعد الدین دو …ں کے بانی ہیں دونوں کی درسگاہیں الگ الگ تھیں جن میں فضلائے علم کا جم غفیر فیض حاصل کرتا تھا۔ شیخ سعد الدین علم ظاہر …جامع تھے شاعری سے بھی ذوق اور سعدی تخلص تھا۔ ان درس گاہوں کے مقابل میں شیخ عبد القادر کی درسگاہ تھی جس میں …محمد کا علم شباب پر آیا پھر انھوں نے اپنی درسگاہ الگ قائم کی جس میں شیخ محمد آفاق لکھنوی۔ محمد رضا لکھنوی میر محمد شفیع …ر شیخ غلام نقشبند گورکھپوری کامل بن کے نکلے۔ ان کے علاوہ بہت سے علمائے اودھ موجود تھے۔ اس زمانے …و فضل کے لحاظ سے یہ ایک مقدس صوبہ سمجھا جاتا تھا۔

…ں صدی ہجری

دسویں صدی ہجری میں لکھنؤ کی تاریخ ترقی میں صدیاں ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور دس دس پانچ پانچ برس میں ترقی کی منزلیں سامنے آتی ہیں۔

شیر شاہ کے دور حکومت میں یہاں کا حاکم نادر خاں تھا اس نے سونے چاندی کی ایک ٹکسال قائم کی جو شاہان اودھ کے …ست تک قائم رہی انگریزوں کے زمانہ میں اس کا خاتمہ ہوا مگر وہ جگہ اپنے گرد و پیش کے مکانات کے ساتھ آج بھی ٹکسال بطور ایک …شہور ہے۔

… اس زمانہ میں یہ صوبہ علوم باطنیہ کا بھی مرکز تھا اس وجہ سے جب ہمایوں نے سنہ ۹۶۱ھ میں دوبارہ ہندوستان فتح کیا تو اودھ …کے تقدس کے لحاظ سے جناب رسالت مآب کے نام پر نذر کیا۔

اکبر کے زمانے میں میر ابوالغیث بخاری، لکھنؤ کے مشہور علماء میں تھے۔ ایک اور جید عالم مولانا الہ داد تھے جن کے متعلق …ور بدایونی لکھتے ہیں کہ وہ ایک زبردست عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے انھوں نے ایک ایسی جدول مرتب کی تھی …ر وہ علوم کے احکام و مسائل مستخرج ہوتے تھے اور ادب میں مقامات حریری کا جواب لکھا تھا۔

…صدی ہجری تک ہندوستان کا علمی معیار

اس سے پہلے کہ لکھنؤ کی علمی تاریخ کا قدم آگے بڑھے —— پورے ہندوستان کے علمی معیار کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ …علمی منزلت کا صحیح تعین ہو سکے۔

یوں تو ہندوستان میں پانچویں صدی ہجری سے علمائے اسلام کا وجود پایا جاتا ہے لیکن ان کا علمی درجہ بہت بلند نہ تھا …نیا اور حدیث و تفسیر سے لگاؤ رکھنے والے ملّا تھے معقولات میں نہ اتنی بلند پایہ کتابیں تھیں نہ منقولات انکی طرف وہ توجہ …ے کیونکہ ان کے نزدیک اس سے گمراہی کا اندیشہ تھا اور منقولات میں بھی مبتدی تھے۔

مولوی عبد الحئی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علماء میں بڑے وسیع النظر مورخ تھے انھوں نے ایک بے مثل کتاب تاریخ علمائے ہند …لکھی ہے جس کی کئی جلدیں ہیں یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور ندوہ کے کتبخانہ میں محفوظ ہے اسکے حوالے سے مولوی ابو الحسنات ندوی …ر ہندوستان کی قدیم درسگاہیں) میں لکھتے ہیں۔

جس طرح ہمارے زمانے میں منطق و فلسفہ معیار فضیلت ہے اسی طرح دسویں صدی ہجری تک ۔ فقہ و اصول معیار فضیلت تھا ۔ حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی وہ امام الدنیا فی الحدیث کے لقب کا مستحق ہوجاتا تھا

آزاد بلگرامی اور ضیائے برنی کا دعویٰ کہ ان علمار کا مثل سمرقند و بخارا بلکہ ربع مسکون میں نہ تھا اس لحاظ سے صحیح ہے اس وقت جو معیار لیاقت تھا اس میں انکا مثل نہ تھا ۔

سمرقند و بخارا وہی مقام ہیں جہاں کے علمار نے عبداللہ خان ازبک کو علوم عقلیہ کی تعلیم کی حرمت کا فتویٰ لکھ کے اور قاضی ابو المعالی ۔ ملا عصام الدین ۔ ملا مرزا جان ایسے فلاسفہ وہاں سے نکالے گئے قاضی ابو المعالی ہندوستان آئے اکبر کی قدر دانیوں سے سرفراز ہوئے ۔

ملا عبدالقادر بدایونی ذکر سکندر لودھی میں لکھتے ہیں ۔

> شیخ عبدالقادر و شیخ عزیز اللہ تلنبی (تلنبہ ملتان کا ایک گاؤں) اس طرف آئے اور علوم معقول کو ان اطراف میں رواج دیا اس سے پہلے سوائے شرح شمسیہ اور صحائف کے ہندوستان میں شائع نہ تھا ۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ان دونوں عزیزوں کی درسگاہ سے دو کامل نکلے میاں حاتم سنبھلی اور مولانا الہ داد جون ان دونوں کے تبحر علمی کو اس شد و مد سے بیان کیا ہے کہ میاں حاتم سنبھلی نے بیس دفعہ سے زیادہ مفتاح اور چالیس دفعہ زیادہ مطول کا درس دیا تھا اور ملائے جونپوری نے فقہ میں شرح ہدایہ اور نحو میں شرح کافیہ اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا ۔ یہ تھی ان کی معراج علم ۔

شیخ الاسلام مولانا فرید الدین شافعی جن کے متعلق آزاد بلگرامی اور ضیائے برنی نے لکھا ہے کہ ان کا اور ان کی مجلس در میں بیٹھنے والے علمار کا مثل ربع مسکون میں نہ تھا اور انبوہ کثیر علمار کا ان کی مجلس درس میں شریک ہوتا تھا ان کی درسگاہ میں کش پڑھائی جاتی تھی ۔ قابلیت عالم بالا معلوم شد ۔ (باقی)

تین اہم کتابیں

تدریس اردو — اردو تدریس پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی عالمانہ تصنیف جو زبان کی تعلیم و تدریس کے جدید ترین اصول و قواعد اور تازہ ترین قومی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے ۔ قیمت ۔ ۴ روپے

اردو رباعی — ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ جس میں اردو فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار رباعی کے فن، موضوع اور ارتقار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ قیمت ۔ ۵ روپے

تحقیق و تنقید — تحقیقی و تنقیدی معاملات کا مجموعہ جس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے زبان و ادب کے نہایت اہم اور نئے موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا ہے ۔ قیمت ۔ ۳ روپے

جلال الدین خلجی اور سیّد مولا کا قتل

(نیاز فتحپوری)

سیّد مولا یا مولہ ایک درویش تھا جو جلال الدین خلجی کے حکمراں ہونے سے پہلے ہی بزمانۂ غیاث الدین بلبن ولایت ملک بالا (غالباً ترکستان) سے دہلی آگیا تھا۔

طبقات شیخ عین الدین بیجاپوری میں لکھا ہے "سید مولا جرجان سے شیخ فرید الدین (گنج شکر) کی زیارت کو ہندوستان آیا اور پھر اپنے پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق دہلی میں مقیم ہو گیا۔ یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کی حکومت کا تھا اور سید مولا کی شہرت اس وقت بہت عام ہو گئی تھی۔ تمام امرا اس کے پاس آتے اور نہایت عقیدت کے ساتھ دست بوس ہوتے، اور کہا جاتا ہے کہ کسی سے ایک پیسہ نہیں لیتا تھا لیکن اس کے مصارف بڑے شاہانہ تھے۔ اس نے زر کثیر صرف کر کے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ لنگر جاری کیا کہ اس کے مطبخ میں روزانہ ایک ہزار من میدہ، دو سو من قند، دو سو من شکر اور پانسو من گھی کا صرف تھا (ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی شامل ہو گو فرشتہ طبقات اکبری اور تاریخ فیروز شاہی سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے)

علاوہ اس کے وہ لوگوں کو ہزاروں اشرفیاں کبھی بطور انعام تقسیم کر دیا کرتا تھا جس سے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسے دست غیب حاصل ہے۔ الغرض اس کی زندگی ایک معمہ تھی اور لوگوں نے ہر طرف سے اسے گھیر رکھا تھا۔

جب بلبن کے انتقال کے بعد معز الدین کیقباد کی حکومت بھی ختم ہوئی تو ۶۸۹ھ میں خلجیوں کا دور شروع ہوا جس کا پہلا فرمانروا جلال الدین خلجی تھا۔ اس کے عہد میں بھی سید مولا کا وہی زور و طنطنہ قائم تھا اور تمام امرا اس کے آستانے پر حاضری دیا کرتے تھے۔ انھیں میں ایک شخص قاضی جلال الدین کاشانی بھی تھا جو خطرناک بڑا مفسد شخص تھا اور چاہتا تھا کہ جلال الدین کو (جس کی عمر ستر سال سے متجاوز ہو چکی تھی) قتل کر کے خود تخت نشیں ہو جائے۔ چونکہ یہ سید مولا کا بڑا مقرب شخص تھا اور سید مولا کے مرید ملک بھر میں جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اس کا بڑا اثر قائم تھا اس لئے اس نے جلال الدین کے خلاف سازش شروع کی اور آخر کار یہ طے پا گیا کہ آئندہ جمعہ کو جب بادشاہ نماز جمعہ کے لئے برآمد ہو تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اتفاق سے اس سازشی جماعت میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو سلطان جلال الدین کا بہی خواہ تھا۔ وہ فوراً بادشاہ کے پاس گیا اور تمام حالات عرض کر دیئے۔ بادشاہ نے ان سب کو طلب کیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور تحقیقات سے کوئی شہادت ایسی فراہم نہ ہو سکی جس سے جرم سازش ثابت ہو جاتا۔ تاہم دیگر ذرائع سے ایسی سازش کا پایا جانا ثابت ہو چکا تھا۔ اس لئے قاضی جلال الدین کو عہدۂ قضا پر بدایوں بھیجدیا گیا اور دیگر امراء کو جو سازش میں شریک تھے خارج البلد کر دیا گیا۔

چونکہ معاملہ خانقاہ کے مریدوں کا تھا اس لئے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے سید مولا بھی اس میں شریک
اس لئے وہ بھی قطب کے سامنے لایا گیا۔ بادشاہ اس وقت بالا خانے پر بیٹھا تھا اور شیخ ابوبکر طوسی بھی اپنے چند مریدوں کے سا
موجود تھا۔ بادشاہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھو سید مولا نے مجھ پر کتنا ظلم کیا ہے۔ تمھیں انصاف کرو" یہ سنتے ہی ط
کے ایک مرید نے سید مولا پر حملہ کر دیا اور استرے سے اس کو کئی جگہ زخمی کر دیا لیکن قبل اس کے کہ خود بادشاہ کوئی حکم دیتا یا
فیصلہ سناتا، شہزادہ ارکلی خاں نے وہیں بالا خانہ سے ایک نیلبان کو اشارہ کیا اور اس نے ہاتھی بڑھا کر سید مولا کو کچل د

ان واقعات سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ سید مولا کو جلال الدین نے اپنے حضور میں ضرور طلب کیا تھا، لیکن قبل اس کے
وہ کوئی فیصلہ صادر کرتا، ابوبکر طوسی اور جلال الدین کے بیٹے ارکلی خاں نے اس غریب کا کام تمام کرا دیا اور جلال الدین کو ا
ذمہ دار قرار دیا گیا جو بالکل خلاف انصاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سید مولا کے خلاف جلال الدین کے کان ضرور بھرے
ہوں گے اور چونکہ سازش کی جگہ خانقاہ ہی تھی اس لئے سید مولا کی شرکت بھی اس سازش میں بہ آسانی یقین کی جا سکتی تھی لیـ
دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جلال الدین نے اس سازش کی خبر ملنے پر کیا کیا۔ اس نے برہم ہو کر یہ حکم نہیں دیا کہ ان سب کو تہ تیغ کر
جائے بلکہ معاملہ کی تحقیق کی اور جب کوئی ثبوت نہ مل سکا (حالانکہ سازش کا اسے یقین تھا) تو اس نے قاضی جلال الدین کو جو
سازش کا اصل بانی تھا، صرف یہ سزا دی کہ اسکو بداؤں بھیج دیا اور خدمت قضا سے بھی اسے معزول نہیں کیا۔ اس صورت میں
یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے اس نے سید مولا کو جس کا تعلق سازش سے تھا بھی نہیں قتل کرا دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ سید مولا کی
مقبولیت کو بعض امراء و اراکین بڑی حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اس کو کسی نہ کسی طرح
کیا جائے، خصوصیت کے ساتھ شہزادہ ارکلی خاں کہ وہ سید مولا کو اپنا حریف سمجھ کر اس کی جان کا دشمن ہو گیا تھا۔ اس لئے جب
سازش کا پتہ چلا تو اس کا تنہا ذمہ دار سید مولا کو قرار دے دیا اور قبل اس کے کہ جلال الدین خود کوئی حکم دیتا ارکلی خاں
موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے ہاتھی سے کچلوا دیا۔

سلطان جلال الدین کے متعلق تمام مورخین کا فیصلہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نرم دل واقع ہوا تھا اور خدا ترسی د
اس کی فطرت ثانیہ تھی۔

جب غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو نے بغاوت کی اور ارکلی خاں نے اس کے بعض ساتھیوں کو گرفتار کر کے گر
میں دوشاخہ ڈال کر قیدی کی حیثیت سے دہلی بھیجا تو جلال الدین یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھا اور حکم دیا کہ انھیں فوراً حمام میں لے
اور اس کے بعد دربار میں بلا کر انھیں خلعت بھی عطا کی۔ اتفاق سے چند دن بعد ملک چھجو بھی گرفتار ہو گیا۔ لیکن جلال الدین
اس کو سزا دینے کے بجائے ملتان بھیج دیا۔ اور وہاں کے حاکم کو لکھا کہ اس کو نہایت دلجوئی سے رکھا جائے۔ اور اس کے لئے تمت
عیش و تفریح مہیا کیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ دشمنوں کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ان کو قتل کر دینا چاہئے۔ لیکن جلال الد
کہا کہ اس وقت تک میں نے کسی کا خون نہیں بہایا اب آخری عمر میں کیونکر اس کی جرأت کر سکتا ہوں۔ اس واقعہ کو ضیاء الدین
نے تاریخ فیروز شاہی میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ مثال اس کے رحم و کرم کی یہ ہے کہ جس ز
میں وہ قبل تخت نشینی منڈاہروں کے دیہات کی تسخیر میں مصروف تھا تو ایک منڈاہر نے بڑھ کر اس کے چہرے پر تلوار کا وار کیا ا
زخمی کر دیا کہ برابر ایک سال تک بیمار رہا اور زخم کا نشان آخر عمر تک نہ گیا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو یہ منڈاہر بھی اپنی گردن میں رسی
حاضر ہوا۔ جلال الدین نے اس کو دیکھ کر کہا کہ میں نے اس منڈاہر سے زیادہ جری مرد کوئی نہیں دیکھا اور علاوہ خلعت وغیرہ

۔۔۔لکھ جیتل اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

اسی طرح مولانا جلال ـــــــ نے اس کی ہجو میں ایک مثنوی خلجی نامہ کے نام سے لکھی تھی۔ لیکن جب یہ بادشاہ ہوا تو مولانا ۔۔۔ں بھی گناہ گاروں کی طرح دربار میں حاضر ہوئے اور بادشاہ نے نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کر دیا بلکہ ان کی ۔۔۔میں ایک اور گاؤں کا اضافہ کر دیا۔ اسی طرح جب مالوہ فتح کرنے کے بعد اس نے قلعہ رنتھنبور کا محاصرہ کیا اور تمام منجنیق وغیرہ ۔۔۔و تباہ کرنے کے لئے نصب کرا دیں۔ تو اس کام کو صرف اس وجہ سے انجام تک نہ پہونچا سکا کہ اس میں زیادہ خونریزی ہوتی اور ۔۔۔ت اسے بالکل پسند نہ تھی۔

یہ تھی جلال الدین کی فطری خدا ترسی۔ نرم دلی۔ اور امن پسندی۔ اس لئے یہ کہنا کہ اس نے خود سید مولا کو قتل کرا دیا کیونکر ۔۔۔یقین ہو سکتا ہے ـــ جو شخص اپنے اوپر قاتلانہ حملہ کرنے والے کو بھی معاف کر سکتا ہے وہ سید مولا کو کیوں قتل کرا دیتا جبکہ ۔۔۔ش میں اس کا کوئی ثبوت بھی فراہم نہ تھا۔

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ

مومن نمبر

مرتبہ ـ نیاز فتحپوری

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخ حرم بھی ہے اور رند شاہد باز بھی۔ اسلئے اسکی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔ یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہل ذوق کے لئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ

مومن نمبر کے مطالعہ سے ہوگا

اس نمبر میں مومن کی سوانح حیات، معاشقہ، غزل گوئی، قصیدہ نگاری، مثنویات و رباعیات اور خصوصیات کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔

قیمت ـ چار روپے

نگارِ پاکستان ـ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

مثنوی قطب مشتری اور ملّا وجہی کی کردار نگاری

(نسیم اختر پالوی)

کوئی بھی کہانی خلا میں پروان نہیں چڑھتی۔ اس کے تمام واقعات انسانی مشاہدوں کی بنا پر تراشے جاتے ہیں۔ اگر مافوق الفطری عناصر بھی کہانی کی جان ہوں تو ان میں بھی ایک فطری اور اصولی زندگی کا وجود ضروری ہے۔ انسان کا دماغ عرش اعلیٰ کی بلندیوں تک پرواز کرے یا تحت الثریٰ کی پستیوں تک جا پہنچے۔ وہ زندگی سے الگ ہو کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ ہر جگہ وہ تقریباً ایسی زندگی سے دوچار ہوتا ہے جس کا مشاہدہ اس نے اس جہان آب و گل میں کیا ہے۔ وہی جنس کے احساسات، وہی شعائر حسن پرستی۔ عیش و عشرت کی فراوانی مسرت اور انبساط کے جوش قدح سے بزم چراغاں کی کیفیتیں۔ لیکن ایک فن کار ان حقائق حیات میں زیادہ بالیدگی، زیادہ جاذبیت اور زیادہ قوت پیدا کر کے حسن آفرینی کرتا ہے۔ افسانوی ادب میں اس حسن سازی کے لئے زندہ کرداروں کا چند فطری اصولوں کے تحت چلنا ضروری ہے۔ فطری اصول کے اس چلن کو جو فن کار جتنا زیادہ بہتر طریقے سے نبھا سکے وہ اتنا ہی بہتر کردار نگاری کا حسن پیش کر سکتا ہے۔ کرداروں کی داخلی و خارجی نفسیات کا جائزہ ان کی حرکت و عمل کا تسلسل، ان کے طرز فکر اور طرز عمل کی دلپذیری اچھی کردار نگاری پر ہی منحصر ہیں۔ کردار نگاری سے فن میں جامعیت اور کشش و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی آفاقی قدروں اور مقامی اثرات سے فنکار کو دوچار ہونا چاہیئے۔ وہ اگر آفاقی اقدار سے رشتہ توڑے تو اس کے فن پارے میں ہمہ گیری اور لافانی زندگی کا وجود مفقود ہو جائے گا اور اگر مقامی اثرات سے فن کو الگ رکھا جائے تو اس کی اثر آفرینی میں بین کمی ہو جائے گی۔ ایک اچھا فنکار آفاقیت اور مقامیت کا ایک دلپذیر سنگم قائم کرتا ہے۔ کردار نگاری میں بھی اس حسن کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ انسانی نفسیات کی تشکیل میں جہاں آفاقی اثرات پڑتے ہیں وہیں مقامی رنگ خود بخود ظاہر ہونے لگتا ہے۔

"قطب مشتری" کے کرداروں میں زندگی کے اثرات ملتے ہیں لیکن وہ بھرپور زندگی نہیں ملتی جو ہماری جبلت حسن کی تسکین کا سامان کر سکے۔ کہتے ہیں اس مثنوی کے واقعات حقیقی ہیں اور یہ دراصل قطب شاہ اور بھاگ متی کے رومان انگیز تعلقات کی منظوم کہانی ہے۔ ظاہر ہے ایسے مواقع جب فن کار کے ہاتھ آ جائیں اور اس میں اپنی مخصوص رنگ آمیزی کی بھی آزادی حاصل ہو تو ایک اچھا فنکار اس میں میناکاری کے کمالات دکھائے گا۔ خارجی اور داخلی کوائف کی پرکشش خاکہ نگاری، حسن ادا اور طرز اظہار کی جاذبیت، حرکت و عمل کی تصویر کشی سے کہانی کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وجہی کردار نگاری میں وہ فن کارانہ اعجاز نہ دکھا سکا۔ وہ اپنے کرداروں کے داخلی کوائف سے اکثر دامن بچا لے جاتا ہے۔ غواصی نے سیف الملوک اور بدیع الجمال کے ہیرو اور ہیروئن کے داخلی جذبات کی بڑی حقیقی اور جاذب دل تصویریں بنائی ہیں۔ طوطی نامہ میں ہیرو ایک طرف اپنی حسین و جمیل پری تمثال بیوی کی دلجوئی کرتا ہے اور دوسری طرف طوطے کی بتائی ہوئی اس حسینۂ روزگار کا والہانہ عشق بھی ہو جاتا ہے۔ داخلی کشمکش کا یہ حسن

ے ہاں دور دور نظر نہیں آتا۔ ابن نشاطی کی "پھول بن" میں بھی قطب مشتری سے زیادہ بہتر کردار نگاری کے نمونے ملتے ں صنعتی کی مثنوی "قصہ بے نظیر" کی کردار نگاری پر وجہی کی قطب مشتری کو فوقیت حاصل ہے۔ وجہی کے ساتھ ایک یہ بھی روا رکھنی پڑتی ہے کہ وہ ان مثنوی نگاروں سے قبل قطب مشتری کی تخلیق کر چکا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ بعد میں لکھنے نے اس سے استفادہ کرکے ایک نئی طرح کی بنا ڈالی ہو اور ان سے آگے نکل گئے ہوں۔

مثنوی نگاری کے روایتی ابواب یعنی حمد، نعت، منقبت، تعریف عشق مدح فرمانروا جو کردار باضابطہ سامنے آتا ابراہیم قطب شاہ کا کردار ہے۔ اس کردار کی سب سے بڑی خوبی اس کی بزرگی تمسیر اور پختہ نظری ہے۔ ب اپنے نو عمر بیٹے کو دنیائے خواب کی پری پیکر کا گرفتار دیکھتا ہے تو اسے سمجھاتا ہے کہ اس دنیا میں دل لگانے کے قابل صرف ات خداوندی ہے اور بس۔ اگر کسی سے رشتہ مہر و وفا قائم کرنا بھی ہو تو بس ایک "کرتار" یہ رشتہ استوار کرنا چاہیئے کیونکہ ے زیادہ پائدار محبوب اور کہیں نہیں۔ سب سے زیادہ گہرائی۔ اس کردار میں وہاں ملتی ہے جہاں یہ اپنے پہلو میں ایک ادل لے کر رونما ہوتا ہے اور اپنی پدرانہ بے قراریوں کا اظہار کرتا ہے۔ ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ انتہا سے ں میں ایک ایسی حرکت کا بھی مرتکب ہوتا ہے جو ایک باپ کی حیثیت سے اسے زیب نہیں دیتی۔ اس نے ایک مجلس طرب کر کے۔ چین، ترکستان، کشمیر اور نہ جانے کہاں کہاں کی دوشیزاؤں کو جمع کر لیا اور انھیں ہدایت کی ؎

قطب شاہ جیکوئی ریجھائیگی — بڑا مرتبا سب میں وو پائیگی
بڑی نار وہ ہے جو بھاوے اسے — کسے بخت ہے جو رجھاوے لے

یہ ایک باپ کے فقرے ہیں جو اپنے بیٹے کے جذبات عشق کی چنگاریوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نکلے ہیں اور پھر ایک باپ اپنے لخت جگر کو نصیحتیں کرتا ہے ؎

جتے اس زمانے منے یار ہیں — دغا باز عیباں جنن ہار ہیں

شفیق باپ کی پختہ کار بصیرت نے دنیائے دنی کی اس زوال آمادہ محبت کو "کرتار" حقیقی کی لازوال محبت سے ہیچ بتایا تھا۔ ہر چند کہ جواں سال پسر کے سرمایہ عقل و دانش کو عشق مجازی کے شعلوں نے خاکستر بنا دیا تھا۔ بیٹے کی اس عشق کو دیکھ کر باپ نے ماں سے کہا ؎

شہنشا سنا بات بو سر بسر — چلیا[1] فکر دنہ ہو حرم کے ادھر
کہیا مائی کو باپ وو آئے کر — کہ فرزند کوں دیک ٹک جائے کر

یہیں سے قطب شاہ کی ماں کا کردار بھی نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن ماں کے کردار میں بہت زیادہ حلاوت نہیں۔ یہ زیادہ دیر تک اپنی ہستی پر قرار نہیں رکھتا۔ ہر چند کہ وہ ہیرو کی ماں ہے لیکن ہیرو کی ماں جیسی استواری اس میں نہیں۔ وہ ایک معمولی درجے کی ذیلی کردار باقی رہ جاتی ہے اور بس۔ اس کی وجہ شاید جاگیر دارانہ نظام کے وہ رسوم تھے جو زندگی کی دو میں عورتوں کا دخل عمل غیر مستحسن قرار دیتے تھے۔ ماں بیٹے کے تعشق کا حال سن کر حواس باختہ ہو جاتی ہے، لیکن

قدیم دکنی مثنویوں میں الفاظ کے ہجے باعتبار صوت ہوتے تھے۔

۱ دکنی مثنویوں میں بعض الفاظ میں "ی" کا زائد استعمال ملتا ہے۔ جیسے چلا، کہا وغیرہ کی جگہ چلیا، کہیا وغیرہ۔

قصے کے ارتقا میں کوئی معاونت نہیں کرتی۔ یہی حال مثنوی گلزار نسیم اور سحر البیان کا بھی ہے۔ شمالی ہند کی ان دو معروف مثنویوں میں بھی قطب مشتری کی طرح صنف لطیف بس حسینۂ تقویٰ شکن بن کر ہی اپنے اثرات ڈالتی ہے دراصل ہم اردو ا… میں عورت ابھر سکتی تھی تو لہو و لعب اور ہوس کے چٹخاروں کے ذریعہ ابھر سکتی تھی۔

ابراہیم قطب شاہ کا کردار مثنوی کے آغاز میں رونما ہوتا ہے اور پھر انجام میں اختتام واقعہ کے قریب ابھرتا ہے۔ اس میں دور اندیشی، پختہ کاری اور ہوشمندیاں شامل ہیں لیکن اس میں وہ فنی روح نہیں ملتی جو اسے حیات جاوداں بخش سکے۔ میر حسن کے "کسی ملک میں تھا کوئی بادشاہ" جیسی استواری بھی یہاں نہیں۔ نسیم کے پورب کے شہنشاہ کے کردار کی استقامت ابراہیم قطب شاہ میں ناپید ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کے کردار کو ہٹا بھی دیا جائے تو نفس قصہ میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کردار ماجرے کا ایک لازمی جزو نہیں بنتا بس حق پیوند کاری ادا کرتا ہے۔

اس مثنوی کا ہیرو قطب شاہ اور اس کا معاون کردار عطارد ہے۔ دراصل قطب مشتری کے معاون کردار تین ہی ہیں قطب شاہ، عطارد اور مشتری۔ قطب شاہ قصے کا ہیرو ہے لیکن اس کے کردار میں ملا وجہی نے تازہ کاریوں اور جدت طر… سے کوئی تعلق نہیں رکھا ہے۔ مثنوی کے ہیرو کا وہی روایتی انداز ہے جو دکنی اور شمالی ہند کی مثنویوں میں عام ہے۔ قطب ایک حسین و جمیل شہزادہ، ہر فن میں طاق اور ہر ہنر میں مشاق ہے ؎

تیا زور تھا ذہن شہزاد کوں
کہ تعلیم کچھ دیوے استاد کوں

اور پھر شجاعت اور زور آوری کا یہ عالم ہے کہ ؎

اگر شاہ لیوے خنجر ہاتھ میں　　او دیٹے پکڑ باگ کو بات میں

یہ سب غیر فطری اور مصنوعی صفات ہیں جن میں بے جان اور پھیکے تاثرات ملتے ہیں۔ ادب میں پرکاری اور تازہ کاری از… ضروری ہے۔ وجہی میں وہ کامل فنکاری نہ تھی جو اس کی بصیرت پر یہ نکات واضح کرتی۔ گرچہ وجہی کو اپنی جدت طرازی پر فخر ہے۔

قطب شاہ کے کردار میں ایک دیو مالائی ہیرو کا کردار ملتا ہے۔ دیو مالائی ہیرو کے کرداروں میں اور بھی بہت س… خوبیاں ہوتی تھیں جو انہیں حیات جاوداں عطا کرتی تھیں۔ ان کا طرز، ان کی جذباتی خوبیاں، ان کے احساسات کی ذکا… ان سے متعلق عوام کی عقیدتمندیاں اور سب سے بڑھ کر ان کے کارنامے تھے جو انہیں پائندہ تر بناتے تھے۔ لیکن دوسری طرف قطب مشتری کا ہیرو ایک ایسا پتلہ ہے جس کی خراش و تراش میں فنکار نے وہ ابدی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی جسے لازوال جاذبیت سے موسوم کر سکیں۔ شہزادہ خواب دیکھتا ہے۔ بنگال کی شہزادی مشتری اسے نظر آتی ہے اور وہ اس کے عشق… اسیر ہو جاتا ہے۔ اس قدر خواب ناک واقعات فطری نہیں ہو سکتے۔ لیکن غیر فطری ہو کر بھی ان میں زندگی ہوتی اگر مثنوی… کردار سازی میں فن کارانہ بصیرتوں کا ثبوت دیتا۔

قطب شاہ کے کردار میں مہم بازی (Adentures) کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ وہ راہ کی تمام کلف… کو برداشت کرتا ہوا اپنے ندیم خاص عطارد کے ساتھ سوزش عشق سے رفتاں و خیزاں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ راستے میں وہ ا… لاکھشش اور پری کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے کردار میں کبھی کبھی حقیقی شجاعت اور فطری دلیری کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ … میں جب بھیانک اژدھے کا سامنا ہوتا ہے تو عطارد اسے لوٹ جانے کا مشورہ دیتا ہے لیکن قطب شاہ کی حمیت م…

میں آگ تی ہے اور جذبات عشق کا وہ متوالا بڑی لاپروائی سے کہتا ہے ؎

کہے شہ کہ مردان مرداں کہیں
انگے کا پیچھے پانو رکھتے نہیں

یہ ایک مہم پسند ہیرو کے جذبات حمیت کی حسین تصویر کشی ہے۔ اور پھر ہیرو کا کارنامہ (Adventure)
سامنے آتا ہے۔ اژدہے پر وہ بھرپور وار کرتا ہے ؎

سو شہ بات کا ایک اسے گھاو لگ
دو ٹکڑے ہو سپیتے پانو لگ

اور پھر راکھشش کا انجام بھی ملاحظہ ہو ؎

کشش کو جو شہ تیر مارے سو دو   پڑا بھس پہ تل سیرا پر پانو ہو

راکھشش پر قابو پانے کے بعد وہ ماہتاب پری سے دوچار ہوتا ہے اور اس سے بھائی بہن کا رشتہ قائم کرتا ہے
حقیقت یہ ہے کہ ماہتاب اور قطب شاہ کی ملاقات جس تیور کے ساتھ ہوتی ہے اس فضا میں ان دونوں کا بھائی بہن
جانا حیرت انگیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبعاً ملا وجہی مذہب عشق مجازی کا موحد تھا چنانچہ اسے ایک سے زیادہ بت لازم
پرستش شاق گزرتی تھی۔ حالانکہ اس طرح کے افسانوں میں اکثر ہیرو دو دو تین عورتوں سے مواصلت رکھتا ہے۔ فسانۂ عجائب کا ہیرو۔ مثنوی گلزار نسیم کا
ہو۔ سحر البیان کا ہیرو سب کے سب طوعاً و کرہاً یا برضا و رغبت کئی کئی کا فراداؤں سے اپنی ہوسناکیوں کی آگ بجھاتے
یا ان کی بوالہوسیوں کی تسکین کا سامان بنتے ہیں۔ قطب مشتری میں یہ ایک جدت ہے کہ اس کا ہیرو ایک زلف کا گرفتار اور
ہی بت کا پرستار ہے۔ وجہی کے بعد غواصی نے مثنویاں لکھیں۔ بدیع الجمال اور سیف الملوک اور طوطی نامہ میں بھی ہیرو
سری پری تمثال کا متوالا ہو جاتا ہے۔ اور اس واقع کی بنا پر ہی کہانی کی مرکزیت کو برقرار رکھتا ہے۔
مہتاب پری کے قریب پہنچ کر قطب شاہ کا کردار منجمد ہو جاتا ہے۔ عطارد اسے مہتاب کے پاس چھوڑ کر خود بنگالے
راہ لیتا ہے۔ اس انجماد کی کوئی منطقی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ عطارد صرف اس قدر توضیح کرتا ہے کہ راہ کی دشواریوں کے
نظر شہزادے کو آگے قدم نہیں بڑھانا چاہیے۔ حالانکہ یہ وہ شہزادہ ہے جو یاد معشوق کی تڑپ میں دارالسلطنت
نہ ٹھہر سکا تھا..... حیرت ہے کہ وہ منزل مقصود سے قریب پہنچ کر کیوں مہتاب پری کے پاس رہ کر اوقات ہجر
کرنے پر آمادہ ہو گیا۔
بنگالہ پہنچکر عطارد جب قطب شاہ کی تصویر دکھا کر مشتری کو اس کا گردیدہ بنا لیتا ہے تو پھر وہ شہزادے کو خط کے
لیے بلاتا ہے۔ یہاں سے قطب شاہ کے کردار میں پھر تحریک شروع ہوتی ہے۔ وہ مہتاب سے نہایت پتن اور محبت آمیز
الفاظ میں اجازت سفر طلب کرتا ہے۔ وہ ایک دیوانۂ حسن ہے لیکن اصول دنیاداری سے بیگانہ نہیں۔ اخلاقی فرائض

برٹش میوزیم کے نسخۂ مثنوی کے مطابق یہی دو مہم شہزادے کو پیش آتے ہیں۔ لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے
اپنے نسخے سے ایک تیسرے مہم یعنی سیمرغ سے مقابلہ بھی دکھایا ہے :

اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے میزبان کا شکر گزار ہو اور اس کی اجازت کے بغیر کوچۂ جاناں کی طرف سرگرم سفر نہ ہو۔ ۵

ترا پیار منج پر اہے اے پری — کہ منج سوں تو سٹی آدمیت کری
رضا دے تو خوشنود ہو کر مجھے — کہ توں ہے پری ہے ترا ڈر منجے

الغرض وہ بنگالہ پہنچتا ہے۔ عطارد کی مدد سے اسے وصل معشوق حاصل ہوتا ہے۔ وہ ایک رفیق مخلص بھی ہے اس اس موقعہ کیف و نشاط پر بھی اپنے ہم سفر دوست مریخ خاں کو فراموش نہیں کرتا اور مشتری سے سفارش کر کے اس کی شادی سے رچا دیتا ہے جو مشتری کی چھوٹی بہن ہے۔ اس طرح اس طرح یہ مثنوی کا ہیرو اپنے مقصد سے شاد کام اپنی حکومت کو لوٹ جاتا ہے۔

قطب شاہ کے کردار میں خلوص، تعشق، جذبات کی وارفتگی، شجاعت، حمیت اور غیرت کے نمونے ملتے ہیں۔ جاناں میں اس کا اضطراب دراصل اس کے دلی جذبات کی صداقت کو ظاہر کرتا ہے۔ ماں باپ کا یہ فرمانبردار بیٹا جب جد ہوتا ہے تو والدین کی تسلی کے لئے کہتا ہے ۵

نکلنا کسے گھر تے بھاتا اہے — منجے دل پوستی لے جاتا اہے

پھر وہ اپنے "ستی دل" کے ساتھ آمادۂ سفر ہوتا ہے۔ اس کے ارادے میں بڑی پختگی اور استقامت ہے۔ را دشواریاں اس کے ارادے کو متزلزل نہیں کرتیں۔ اس میں مہم سازی کا جذبہ بھی ہے۔ وہ اژدھے اور رکھشس کا مق کرتا ہے۔ اس میں اخلاقی قوتیں بھی ہیں۔ مہتاب سے وہ بھائی بہن کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ بوقت رخصت اس کی اجازت لی مریخ خاں کو شاد کام مقصد کرنے میں اسکا زبردست ہاتھ ہے۔ الغرض اس کی تمام خارجی کیفیتوں کی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں لیکن افسوس ہے تو اتنا کہ وجہی داخلی کیفیات کی بھرپور عکاسی نہیں کرتا اور کرتا بھی ہے خال خال اور پھیکی پھیکی ہاں کہیں کہیں یہ رنگ بھرپور اور جاذب نظر بھی ہے۔

کدھیں دل میں راکھے کدھیں موں میں لائے
کدھیں کوچ بولے کدھیں کچ چھپائے

شہزادے کے اضطراب عشق کی یہ ایک حسین داخلی تصویر ہے۔ لیکن ایسی تصویریں کمیاب ہیں۔ وجہی اگر ایسے کچھ بھی خاکے پیش کر سکتا تو اس کی فنکارانہ اہمیت زیادہ واضح ہو سکتی تھی۔ وجہی اگر اس قسم کا کوئی اور نقشہ پیش کر سکتا تو اُ ادبی اہمیت تمام دلوں پر نقش ہو جاتی۔ پھر بھی مولوی عبدالحق کا قول صادق ہے کہ "گو یہ مثنوی اعلیٰ پایہ کی نہ ہو۔ تاہم اس بعض باتیں بڑی خوبی کی ہیں" انھیں بعض خوبی کی باتوں میں کہیں کہیں کردار نگاری کی اچھی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ میں ا مثال کے بعد اس تشریح طلب مسئلے کو ختم کرتا ہوں۔ مریخ خاں کی شوریدہ سری عشق دیکھ کر شہزادہ کہتا ہے ۵

ترا اور میرا سو یک حال ہے — دو مچھلیاں بے چاراں کو یک جال ہے
کہ میں خستہ دل ہور تو دل فگار — ہمیں دونوں مل اب اچھیں ایک ٹھار
ہمیں دونوں پنکھی ہیں یک باغ کے — ہمیں دونوں شعلے ہیں یک داغ کے
ہمیں لاابالی، ہمیں باولے — ہمیں جاں خیالی ہیں اور تاولے
ہمیں دو پریشاں ہیں یک جمع کے — ہمیں دو پتنگے ہیں یک شمع کے

کاش کہ وجہی کی کردار نگاری کا ہنر ہر جگہ اسی طرح نمایاں ہوتا تو اس کی یہ مثنوی اپنے دور کی سحر البیان اور گلزار نسیم ہوتی

قطب مشتری کے کرداروں میں نام کا التزام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی طرح قطب مشتری کرداروں کے نام میں ایک تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ اس مثنوی کے تمام کرداروں کے نام سیاروں کے نام پر ہیں۔ شتری، زہرہ، عطارد، مریخ، مہتاب سارے کے سارے کردار سیاروں کے نام سے موسوم ہیں۔ کچھ ناقدین اس بنا پر کو علم نجوم کا ماہر بھی بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح اٹکل قیاسات لاحاصل ہیں۔

قطب شاہ کے بعد اس مثنوی کا معاون کردار جس کی حیثیت مرکزی ہے۔ عطارد نقاش کا نام آتا ہے۔ وہ ایک نقاش کا کام تصویریں بنانا اور حسینوں کی تصویریں جمع کرنا ہے۔ اس کی ہنرمندیوں اور خردمندیوں کی شہرت تھی۔

عجب ایک اس وقت پر مرد تھا ہنرمند عاقل جہاں گرد تھا

جہاں بینی اس کی فطرت تھی جس نے اس کے تجربات میں وسعت پیدا کر دی تھی۔ وہ بھلے اور برے کی شناخت کر سکتا تھا۔

عطارد سوں نقاش کا نام تھا

بھلا ہور برا کار بے نام تھا

وہ شہزادے کے پاس آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ بنگال میں مشتری نام کی ایک شہزادی ہے جس کے حسن و جمال کا ہیں۔ پھر وہ شہزادے کو اس کی تصویر دکھاتا ہے اور شہزادے کو اس کی صورت اس پری تمثال کے مماثل نظر آتی ہے س نے خواب میں دیکھا تھا۔ عشق کے جذبات امنڈ آئے اور شہزادہ اس تصویر پر فدا ہو گیا۔ عطارد نے بڑی دلیری زادے کی اس جذباتیت کا مذاق اڑایا اور اسے ایک جوان دل کی مہمل ترنگ بتایا۔ اس نے نہایت بیباکی سے کہا کہ بت کی طرف شہزادہ کھنچ رہا ہے۔ وہ ایک سستا جذبہ ہے جس کے لئے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اگر سچ پوچھے تو لبر نا بھلا کہ یو کام اندیش کرنا بھلا

اور پھر اس کی بے باکی کا یہ عالم کہ صاف صاف کہتا ہے ؎

تو اپنی جوانی میں شہ غرق ہے مجھے ہور تجھ میں بہتی فرق ہے

وہ اپنی انا کو بھی نہیں بھولتا۔ ضعیفی کی تعریف کر کے در پردہ وہ اپنی بھی تعریف کرتا ہے۔

بڈھاں کی سو تدبیر کچھ ہور ہے جواناں کی سن ہے سو شر شور ہے

لیکن اس کی تجربہ کاری اور شعور کی پختہ کاری اسے استقامت سے بہرہ ور نہ کر سکی۔ پختہ شعور میں مصلحت اندیشی کے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ عطارد کی شخصیت میں بھی یہ عناصر ملتے ہیں۔ مصلحت بے جا اور دور اندیشیوں کے نہ جانے کتنے س کے کردار میں ملتے ہیں۔ وہ شہزادے سے مصلحت کی بنا پر اختلاف کرتا ہے اور پھر مصلحتاً اس کے عشق کو سراہنے مجبور ہو جاتا ہے اور پھر جب اسے راہ کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو بر بنائے مصلحت ہی وہ شہزادے کو مہتاب کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔ اس قدر مصلحت اندیشیاں اس کے کردار کی پائداری اور ناپائداری دونوں پر دلالت کرتی ایک طرف اس میں وہ جوش و خروش وہ حمیت اور وہ جانبازی نہیں جو قطب شاہ کے کردار میں ملتی ہے اور دوسری وہ مسطحیت، وہ جذباتیت وہ عشق مجازی کی بے قراری بھی اس میں نہیں جس نے قطب شاہ کے کردار کو کمزور بنا

ہے۔

عطارد شاید اردو مثنویوں میں اپنے طرز کا واحد کردار ہے جو شہزادے کا مددگار ہو کر بھی اس کا زبردست ناق
اس کا حسن تدبیر ہی شہزادے کو مقصد آشنا کرتا ہے۔ لیکن شہزادے کی خام عقلی کی طرف سب سے پہلے وہی اشارے بھی کرتا ہے۔ اسکی
صلاحیتوں میں نہایت فطری اقدار ملتے ہیں۔ وہ کوئی کام ایسا نہیں کرتا جسے مافوق الفطری یا بعید از فہم کہا جائے وہ
فن کا جادو جگا کر مقصد رسا ہوتا ہے۔ قطب شاہ کی طرح مبالغہ آمیز قوتوں کا حامل ہو کر نہیں۔

عطارد کا کردار ہیرو کے دوش بدوش چلتا ہے بلکہ بعض مقامات پر اسے ہیرو پر بھی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ سحر البیان کی
کی طرح قطب مشتری کا عطارد بھی آخر میں ہیرو کی معاونت تن تنہا کرتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہیرو کی شخصیت نگاہوں سے اوجھ
ہو جاتی ہے۔ افسانوی ادب میں ہیرو کا نظروں سے اوجھل ہو جانا سخت عیب ہے اس طرح پلاٹ کی مرکزیت قائم نہیں رہتی۔
اس عیب کا کفارہ وجہی عطارد کی فطری کردار نگاری سے ادا کر دیتا ہے۔

مشتری اس مثنوی کی ہیروئن ہے۔ وہ ایک شہزادی ہے جس کے حسن کی شہرت دور دور ہے۔ عطارد جسے جہاں گشت نے
بقول خود اس سے زیادہ خوبصورت دوشیزہ نہیں دیکھی۔ مشتری کی دائی مہروان اسکے ساتھ ایک سہیلی کا سا تعلق رکھتی ہے جب اسے عطارد کی
کی خبر ہوتی ہے تو وہ اسے بلوا کر محل کی نقاشی کے کام پر مامور کرتی ہے۔ محل کی دیوار پر عطارد کی بنائی ہوئی قطب شاہ کی تصویر جب وہ دیکھتی ہے تو جو
عشق سے بیہوش ہو جاتی ہے۔ یہ عشق بڑا انوکھا ہے اور اس میں نرالی ادائیں ہیں، یکایک محبت اور تصوراتی دنیا کا عشق، قطب مشتری کا طرۂ امتیاز

صورت شہ کی دیکھنت بھلی نار دو
پڑی بے سدھ ہو کر اسی ٹھار دو

پھر جب وہ اپنی دایہ مہروان کو ماجرائے عشق سناتی ہے تو وہ عطارد کی طرح اسے ملامت کرتی ہے۔

تو چنچل چتوا نار اتنی سی ہے
بھوت چھند بھری بھوت فتنی سی ہے

لیکن مشتری اس طنز پر بپھر اٹھتی ہے ؎

غرض ایسی باتاں سے کہا ہے تجھے
نصیباں منے تھا سو انپڑیا مجھے

اور پھر اس کی بے قراری کی کچھ عجیب کیفیت ہے ؎

کہاں ہے وہ شہ نرملا نوجواں
کہاں ہے وہ شہ گنونتا گن ندھاں

کہاں ہے وہ لالن مٹھی چال کا
کہاں ہے وہ ساجن لنبے بال کا

اس کے جذبات بڑے لطیف ہیں۔ ہجر کی چند راتیں گذارنے کے بعد وہ وصل کی راحتوں سے شاد کام ہوتی ہے
عاشق ہونا، درد عشق میں تڑپنا اور پھر عشق کی وصل انگیزیوں سے حظ اٹھانا ہی اس کی زندگی کی منزلیں ہیں۔ اس کے کردار میں
عام مثنویوں کا سا انداز ہے۔ سحر البیان کی بدر منیر، گلزار نسیم کی گل بکاؤلی اور وجہی کی مشتری میں بہت زیادہ فرق نہیں۔

قطب مشتری کے ذیلی کرداروں میں بہت زیادہ صلاحیتیں نہیں ملتیں۔ یہ مددگار کردار واقعہ کو چند گام آگے بڑھا کر غائب
ہو جاتے ہیں۔ یا اگر غائب نہیں ہوتے تو ساکت ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ، ملکہ، مہتاب، زہرہ، مریخ خاں، مہروان، اژدھا، الکھشش سب کے
سب اپنے اپنے مقام پر ابھر کر ڈوب جاتے ہیں۔ قطب شاہ، ملکہ، مہتاب، مریخ خاں کے کردار کو الگ بھی کر لیا جائے تو نفس قصہ متاثر نہیں ہوتا۔ ہاں مثنوی
میں چند فنی خوبیاں ختم ہو جائیں گی اور چند خالص فنی اشعار غائب ہو جائیں گے۔ زہرہ کا نام تو قطعی فضول ہے۔ اس کا کردار بس ذکری ہے حقیقی نہیں۔
مریخ خاں کی حرکت و عمل کہانی کے ارتقاء میں کوئی تعاون نہیں کرتی۔ یہ سب فاضل کردار ہیں۔

ملا وجہی میں کردار نگاری کی اوسط صلاحیت
ہے۔ وہ کرداروں کی روح میں اتر کر نہاں خانۂ دل کے آئینوں کو جگمگا نہیں سکتا پھر بھی اس نے فن کے جو نمونے پیش کئے ہیں اور کردار نگاری کا جو
آرٹ پیش کیا ہے وہ غنیمت ہیں۔ ادبی اہمیت نہ ہو لیکن تاریخی اہمیت تو اس مثنوی کی بہر حال قائم رہے گی۔

اُردو یا پاکستانی

فیسی خان رشید

یہ صرف دو تلخ سہی لیکن سچی باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں پہلی یہ کہ جب سے اردو کو اردو کا نام دیا گیا یہ مسلمانوں رف ہماری زبان ہے۔ مگر ہم نے حقائق کے خلاف ہمیشہ اسے ہندوؤں سے بھی متعلق کرنے کی کوشش کی، دھوکہ میں مبتلا ور اردو کی تہذیبی اہمیت اور قدر و قیمت کا نہ صحیح احساس پیدا کر سکے نہ اندازہ دوسرے یہ کہ نظری طور پر اردو کو سب کی نے کے باوجود عملی طور پر علاقائی زبانوں کو اردو میں سمو لینے کی منظم کوشش کبھی نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس علاقائی اردو دانوں کو دلی کے معیار سے پرکھنے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ ان دو باتوں نے اردو کو سخت نقصان پہنچایا۔ باتیں عجیب ہیں اور مگر کیا کیجئے کہ حقائق تلخ ہی ہوتے ہیں۔ یہ بات بار بار دہرائی جا چکی ہے کہ اردو نے مختلف اقوام اور مختلف نسلوں کے باہمی کے نتیجہ میں افہام و تفہیم کے رابطہ کی حیثیت سے جنم لیا اور بولی کے دائرہ سے نکل کر بتدریج ادبی حیثیت اختیار اس کے قدیم ترین نام ہندی اور ہندوی ہی ہیں جو بابا فرید گنج شکر مرحوم ۶۶۷ھ/۱۲۶۸ء کے یہاں ملتے ہیں۔ اس کے لیے ریختہ اح سب سے پہلے شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء کے یہاں ملتی ہے۔ ریختہ موسیقی کی اصطلاح ہے جو اردو کی صوتی نغمگی نی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر علاقائی رابطہ سے اسے دکنی، گجری، دہلوی، گوالیاری وغیرہ بھی کہا گیا۔ زو مرحوم ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء نے پہلی مرتبہ اسے اردو کہا۔ ۱۱۶۵ھ/۱۷۸۰ء سے پہلے اردو شعراء میں مصحفی نے سب سے پہلے ردو کہا۔ ؎

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اردو نثر نگاروں میں یہ شرف عطا حسین خاں تحسین کو حاصل ہے۔ جنہوں نے ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں اسے اردو کہا۔ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء من اسے اردو کی زبان، لکھتے ہیں۔ خان آرزو سے اسے 'اردو'، اور اردوئے معلی نہیں کہتے اس کے معنی یہ ہیں کہ دی میں اس کا تعلق لشکر سے تھا بھی تو بے نام مشترک بولی کی حیثیت سے' لیکن اٹھارویں صدی میں یہ لشکر سے ہوگئی اور ہندو مسلم کش مکش کی وجہ سے اسے ہندی سے ممیز کر کے اردو کا نام دینے کی ضرورت پڑی۔ اکبری عہد وں کے احیائے مذہب کی وشنو اور چیتنیہ کی تحریک جاگی تھی اور دکن میں وجیا نگر کا رام راج مسلمانوں کو ہندوستان ک رام راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا جو تالیکوٹ کی جنگ میں مارا گیا۔ لیکن ہندو مسلم منافرت بڑھتی چلی گئی اور خان آرزو کے عہد میں یہ زیادہ شدید ہو گئی جس کی وجہ سے ادبی اردو مسلمانوں کی اپنی زبان قرار پائی۔ اس حد تک کہ

ہندو کی کہانی نظم کرنا بھی ناگوار تھا۔ سید احمد ہنر حیدر آبادی اپنی مثنوی 'بنہ دوپن' میں مسلمانوں کے اسی رجحان کی بنا پر ۱۱۴۲ھ میں لکھتا ہے :- ؎

رکھیں گے بول مجھ پر لوگ گیانی — کہ ہے اس بیچ ہندو کی کہانی
مسلماں کو کہنا ہندو کی کہانی — نہیں کسی باب لگتی ہے سہانی

شمالی ہند میں بھی ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء کے لگ بھگ "تاریخ غریبی" کا مصنف صفی لکھتا ہے۔ ؎

ہندی پر نہ مارو طعنا — سبھی بتاویں ہندی معنا
یہ جو ہے قرآن خدا کا — ہندی کریں بیان سدا سما
لوگوں کو جب کھول بتاویں — ہندی میں کہہ کر سمجھاویں

اس قسم کے اعتذار سے ثابت ہے کہ اس دور میں ادبی اردو مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو چکی تھی کہ عوامی رجحان یہی تھا۔ چونکہ لفظ اردو بھی اسی زمانہ میں استعمال ہوا اس لیے اصولی طور پر جب ہم اردو زبان کہیں تو اس کے پہلے کی بولی اور ز کو نظر انداز کر کے ادبی اردو کی حیثیت سے اٹھارویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کی زبان کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور طرح یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ بولی کی حیثیت سے ہندی، ہندوی، گجری یا ریختہ ہندو مسلمانوں کی مشترک بولی تھی۔ آج بھی ہے ا رہے گی۔ مگر جب سے اردو کہا گیا ہے اور اس کی ادبی حیثیت مسلم ہوئی یہ خالصتاً مسلمانوں کی زبان بن گئی۔ مگر مشترکہ زبان تسلیم کی کوشش میں ہم نے غیر منقسم ہندوستان میں حقائق کو نظر انداز کر دیا اور کبھی کھل کر یہ نہ کہا کہ اردو ہماری اور صر مسلمانوں کی زبان ہے۔ جس کا سارا ادبی سرمایہ ہماری اقدار کا امین اور ہمارے مذہب و ثقافت کا ترجمان ہے۔ حالانکہ ق ترین دور سے اردو کا جو ادبی سرمایہ ملتا ہے اس کا معتد بہ حصہ مذہبی اور اسلامی روایات اور اسلامی تصوف کا نقیب اس غلط انداز فکر نے اردو کو زبردست نقصان پہنچایا ہے اور ہم من حیث القوم پوری شدت احساس کے ساتھ یہ جذبہ نہ کر سکے کہ اردو ہماری اور صرف ہماری ہے۔ ہمیں ہی اس کا تحفظ کرنا ہے اور ہمیں ہی اس کی ترویج کرنی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ا زبان ہندوستان کو تقسیم کروا کے بھی ہماری نہ بن سکی اور ذہنی طور پر ہم اس کے نہ بن سکے بات تلخ ضرور ہے لیکن حقائق کو جھٹلا کر تاریخی جبریت کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اور آج اردو سے جو بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ یہی ہونا تھا اور ایسا نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔!

آج پاکستان کی علاقائی زبانیں جنھیں اردو نے تہذیب و ثقافت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ علاقائی زبانوں نہ جانے کتنے ادیب، شعراء اور مصنفین پیدا کر دیئے جن کا بیشتر سرمایہ اگر مسروقہ نہیں تو اردو ادب کی خوشہ چینی کا نت ضرور ہے، اردو سے رقابت محسوس کر رہی ہیں۔ کچھ احساس کمتری کی بنا پر اور کچھ اس لیے کہ اردو کی موجودگی میں بیشتر اہل نقل اپنے اہلِ قلم ہونے کا ڈھنڈورا نہ پیٹ سکیں گے اور ہمیشہ بھانڈا پھوٹنے کا احتمال رہے گا۔ ورنہ حق یہ ہے کہ ا کے دل اردو کے معترف اور اس کی اسلامی امانت کی قدر و قیمت کا اردو والوں سے زیادہ احساس رکھتے ہیں۔ اسلام اساسی قدر جو پاکستانی قومیت کی بنیاد ہے۔ اور پاکستان کے مختلف علاقوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے اردو ا کی نقیب اور اسی کی روایات کی امین ہی تو ہے۔ . . . . . زبان اور قومیت کے مسئلے کو زیر بحث لاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے غیر ممالک کی مثالیں دیتے وقت یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہونے کی حیثیت سے پوری

منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستانی نظریۂ قومیت پاکستان کا تصور پیش کرنے والے اقبال کے الفاظ میں یہ ہے ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اس لیے یہاں ایک مشترک قومی زبان کا مسئلہ پاکستان کے نصب العین یعنی مذہبی ن سے متعلق ہوگا۔ اسی لیے پاکستان کے قیام کے نظریاتی محرکات صرف مذہب اور زبان ہی تھے۔ یوں اکثریت کے معیار سلہ کرنا گمراہ کن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تو آج دنیا کی اکثریت کی زبان چینی کو عالمی زبان ہونا تھا۔ اور آج جبکہ عیسائیوں کی روایات فظ زبان اور عیسائیوں کے لٹریچر کے علاوہ الحادی عقلیت نے اسلام کی قوت کو پاکستانی معاشرے میں مضمحل کر دیا ہے ی طور پر مذہب نصب العین باقی نہیں رہا تو مشترک زبان ہی تو ہے جو باہمی اتحاد، یگانگت اور پاکستانی قومیت کا سے مضبوط رشتہ ہے۔ مگر وہ بھی علاقائی عصبیتوں کا شکار ہوگئی تو کیا نظریہ پاکستان کے منافی نہ ہوگا۔

آریائی اصل ہونے کے باوجود اردو ہر زبان پر اپنا حق رکھتی ہے۔ ادبی اعتبار سے بلند ہونے کے بعد دوسری زبانوں ی اس پر حق ہے۔ علاقائی زبانیں اس سے مالا مال ہو رہی ہیں لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے۔ اردو کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے ہو جاتا ہے۔ اس کی تطہیر کی کوششیں اسونت بڑھیں جب فرقہ وارانہ تعصب بڑھا۔ اس طرح معاشرہ اس کی تنگ نظری ب بنا اور پھر اردو کو دیس نکالا مل گیا۔ یہی صورت یہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے اگرچہ ہندوستان میں ادبی اردو ہندو سلمانوں کی مشترک زبان "ہندوستانی" نہ بن سکی تھی مگر اب ضرورت ہے کہ وہ اپنا لشکری قسم کا لڑائی جھگڑے والا انداز دے اور اردو نہ رہے بلکہ پاکستانی بن جائے جس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ بڑی فراخدلی سے علاقائی زبانوں سے فیض اٹھا ئج کردے، پنجابی، سندھی، پشتو، بنگالی، ملتانی، بلوچی غرضیکہ ہر پاکستانی زبان کے الفاظ، علاقائی روایات سے ق اصطلاحات اور تلمیحات کو تیزی کے ساتھ اپنائے تاکہ پاکستانی عوام کے احساسات سے اور زیادہ ہم آہنگ ہو جائے اردو کو "اس نے جانا ہے" قسم کی اردو کے ٹکسالی نہ ہونے پر ناک بھوں نہ چڑھانی چاہیئے۔ اور دلی اور لکھنؤ کی پاکستان کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکے رائج کرنے چاہئیں۔ اس طرح اس میں وسعت بھی پیدا ہوگی اور علاقائی یں اپنایت بھی محسوس کریں گی۔ اور حقائق بتاتے ہیں کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ باہمی اتحاد اور اتفاق کی خوشگوار فضا ی جائے احساس برتری رکھنے والے دوسروں کو احساس کمتری میں مبتلا ہونے پر مجبور نہ کریں، بلند اخلاقی، سیر چشمی رواداری کا مظاہرہ کریں اور قائد اعظم کی طرح ایک نصب العین لیکر کوئی تحریک چلائیں جو ذہنی یگانگت کا سبب بنے وقت ممکن ہوگا کہ قائد کی ایک آواز پر سب لبیک پکارتے ہوئے اردو کو پہلے کی طرح دل سے اپنا لیں۔ اگر موجودہ و اپنی ہیئت بدل کر "پاکستانی" نہیں بن جاتی تو اسکا مستقبل خطرے میں ہے۔ سماجی تقاضوں کے تحت خود بخود ایک س اور عام فہم زبان رواج پا رہی ہے۔ عوامی بولی کی حد تک فطرت خود اس کی راہیں متعین کر دے گی۔ مگر مستقبل کی اردو بڑی تشویشناک نظر آتی ہے اس لیے کہ ادبی اردو پڑھے لکھے طبقے کی زبان ہوتی ہے اور اس کا اندازہ نوجوان تعلیم طبقہ کی زبان سے کیا جا سکتا ہے جس میں کم از کم ۲۰ فیصد انگریزی کے الفاظ ضرور ہیں ــ! مستقبل کی ادبی اردو کی جھلک ح نگاروں کی اردو میں دیکھی جا سکتی ہے اس لئے کہ یہ طبقہ قدیم و جدید کی کشمکش کی سب سے پہلے نمائندگی کرتا ہے اور زبان کی تبدیلی ب سے زیادہ ادراک رکھتا ہے کہ بدلتی ہوئی زبان کے لوٹ پھیری سے مزاح پیدا کرتا ہے۔ خواہ وہ خرد اور زلی کا دور ہو یا مجید لاہوری اور ابراہیم جلیس کا۔ اور فی الوقت یہ سوچنا ہے کہ اگر مستقبل کی ادبی اردو یہی بنی

تو کیا تو نظریۂ پاکستان کے مطابق ہوگی ؟ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ عوامی بولی خود بنتی ہے مگر ادبی زبان میں کاٹ چھانٹ کے مصنوعی طریقے پر بھی عمل کیا جاتا ہے ۔ اس لیے غور کیجیے تو اس وقت کا اہم لسانی مسئلہ دراصل انگریزی اور اردو کا مسئلہ ہے ۔ اسی لیے کوشش کرکے انگریزی زبان کی جگہ علاقائی زبانوں کے الفاظ کو اردو میں زیادہ سے زیادہ رائج کرنا ہوگا مستقبل کی زبان انگریزوں کی نہیں تو کالے انگریزوں کی نمائندگی ضرور کرے گی ۔ مسلمانوں کی زبان نہ رہے گی ۔ جس کا تعلق آزاد پاکستان سے برائے نام ہی باقی رہے گا یہی نہیں بلکہ اردو اب بھی اپنا وطن نہ بنا سکی تو اس کی حیثیت ہمیشہ نازی جرمنی کے یہودیوں جیسی رہے گی ۔ اور یہ صورت حال بڑی تشویشناک اور غور طلب ہے ۔

آریائی خاندان کی زبانیں ہونے کی حیثیت سے علاقائی زبانوں اور اردو میں بڑا پرانا رشتہ ہے ۔ گرامر بڑی حد تک اشتراک ہے ۔ ہندی اور فارسی اثرات مشترک ہیں ۔ بنگالی کے علاوہ روایات اور ثقافت میں کبھی اس کا نام ہے ۔ اس رشتہ کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے علاقائی احساسات اور مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے اردو کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر بنانے کی ضرورت ہے اور جس طرح عہد عتیق میں حالات اور ماحول کی مناسبت سے اس کے نام بدلتے رہے ہیں اسی طرح اب اسے پاکستانی بنانا اور " پاکستانی " کہنا چاہیے اس لیے کہ لفظ " اردو " اس کی عسکریت اور لڑائی جھگڑے کی طرف اشارہ کرتا ہے جب کہ آج اسے محبت ، اخوت اور یگانگت کی نمائندگی کرنی ہے ۔

علاقائی زبانوں کو بھی یہ غلط فہمی دل سے نکال دینی چاہیے کہ اردو ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہے اس لیے یہ بات حقائق کے سراسر خلاف ہے ۔ بلکہ اس کے برعکس اردو تو علاقائی بولیوں کو بھی ادبی زبان بنانے میں مدد دے رہی ہے ۔ مختلف صوبوں اور علاقوں کو حق ہے کہ اپنی زبانوں سے محبت کریں اور انھیں پھلنے پھولنے کا موقع دیں مگر قومی اتحاد مشترک مذہب اور مشترک وطن پاکستان کا بھی حق ہے کہ اس کی بقاء اور اتحاد کے لیے علاقائی نہیں بلکہ قومی سطح پر ایک مشترک زبان زبان ہو ، اور یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو کے علاوہ کوئی اور زبان اس کی صلاحیت نہیں رکھتی ۔ مشترک رسم الخط بھی انتہائی ضروری ہے ۔ سچ پوچھیے تو جھگڑے کی بناء سول سروس کے امتحانات ہیں ۔ اس جھگڑے کو یوں ختم کیا جا سکتا ہے کہ انگریزی کو فوراً ہٹا کر اردو کو اس کی جگہ دی جائے مگر حسب منشا علاقائی زبانوں میں بھی جوابات تحریر کرنے کی اجازت ہو ۔ اس زبان نے جو سرسید تحریک کی محرک بنی تقریباً ۹۰ سال کی مسلسل تگ و دو کے بعد ۱۹۴۷ء میں اپنا گھر پاکستان بنا لیا ۔ مگر آج اپنے ہی گھر میں مہمان اور اپنے ہی وطن میں پردیسی ہے اور پکار پکار کر ارباب وطن کو ایک لمحۂ فکریہ عطا کرتی ہے کہ رہی ہے ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ،

عرض نغمہ

ٹیگور کی گیتا نجلی کا سب سے پہلے اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے مع ایک بسیط مقدمہ کے ۔ قیمت ایک روپیہ

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

اقبال کے بعض نظریات، عہد حاضر کی روشنی میں

رفاعی

اقبال کی شاعری ایک خالص ارتقائی عمل کی مظہر ہے جو اپنی مخصوص حدود میں ذہنی بھی ہے اور جذباتی بھی۔ ان کے
ذوق کی بالا سری، ان کے خلوص بے پناہ کی خود فراموش کاری اور کچھ کچھ ان کی وارفتہ مزاجی ان تمام عناصر کے تال میں
کی شاعری کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔

اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری بھی ایک قسم کی تبلیغی شاعری ہے جس کی بنیاد اتحاد قومی کے بے میل جذبے پر رکھی ہوئی ہے
بعد سفر یورپ سے واپسی پر انھوں نے جس انداز سے نغمہ سرائی شروع کی اس کی لے میں بھی یہ تبلیغی زیر و بم موجود ہے
لیکن پہلے کے مقابلے میں اب یہ کچھ زیادہ بلند آہنگ ہو گیا تھا اور اس کا دائرہ اثر بھی نسبتاً وسیع تر ہو چلا تھا۔ پہلے ان کی
ں کا محور و مرکز صرف ہندوستان کی سرزمین تھی لیکن یورپ سے واپسی کے بعد اسلام اور پوری اسلامی دنیا ان کا مطمح نظر بن
، اس لحاظ سے ان کے خیالات میں وسعت اور ان کے نقطۂ نظر میں یک گونہ ہمہ گیری اجاگر ہو چلی تھی، یہ چیز دیکھا جائے
عظمت فکر کی دلیل تھی جس کے مستحسن ہونے میں بظاہر کوئی شبہ نہیں، اقبال کے فکر و خیال کی اس بدلتی ہوئی نہج نے لوگوں کی توجہ
ں کے ساتھ مبذول کرا لیا، ان کی شہرت کو پر پرواز مل گئے اور وہ بہت جلد ہندوستان کی حدود سے نکل کر غیر ممالک
ج گئی۔ ہم ایک طبقہ۔ بہر حال ایسا بھی تھا جو اقبال کی اس شہرت کو ایک اضافی چیز سمجھتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق
سے واپسی پر اقبال ذہنی اعتبار سے پھیلے نہیں بلکہ کچھ اور سمٹ اور سکڑ سے گئے ہیں۔ اس طبقے کے نزدیک اقبال کے
ت کی وسعت و ہمہ گیری ان کی اپنی ذاتی اپج اور ذہنی کاوشوں کا طفیل نہیں بلکہ بیشتر مغربی فلسفے کے مطالعے کی مرہون
ہے، اس بنا پر اس کی کوئی بنیادی حیثیت نہیں۔ اس طبقے کے نزدیک اصل چیز جس نے اقبال کو بغیر کسی مذہبی دلی
ں کے ہر طبقے میں مقبول و محبوب بنا رکھا تھا وہ ان کی وسیع المشربی تھی جو یورپ کے مشینی ماحول میں پہنچ کر مجروح ہو گئی
پہلے ان کی حیثیت محب العالم Cosmopolitan کی سی تھی لیکن اب ان کی آرزوؤں کا محور و مرکز صرف وہ
تھی جس کی حدود نیل کے ساحل سے شروع ہو کر تابخاک کاشغر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے جو تہذیب و
رفتار سے بے خبر و بے اثر بیکسی و بیچارگی کے عالم میں پڑی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی جس کے اخلاقی قویٰ صدیوں
مضمحل ہو کر جواب دے چکے تھے، جو بقائے اصلح کی بنیادی اقدار علم اور عمل دونوں سے بے بہرہ تھی۔ نتیجے کے
بی کی کس مپرسی اپنی انتہائی حدود کو چھو چکی تھی۔ اقبال کے معترضین کا خیال ہے کہ خود اقبال بھی اس حقیقت سے

بے خبر نہیں تھے کہ اس سرزمین کی کوکھ عرصہ ہوا بنجر ہو چکی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ انھوں نے اسی سرزمین سے روئیدگی کشت
کی تازہ کاری توقعات وابستہ کرلیں، معترضین کے نزدیک اقبال کا یہ طرزِ عمل حقیقت سنجی کے تمام اعلیٰ معیاروں کی نف
کرتا ہے، اقبال سے برگشتگی کا ایک سبب اور بھی ہے، وہ شاعر کا یہ استحقاق تو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ کسی خاص گر
سے یک گونہ خصوصیت کا اظہار کرے لیکن یہ توجیہہ قبول کرنے کو تیار نہیں کہ اس خصوصی گروہ کی عظمت و سربلندی کے
یہ بھی لازم ہے کہ دوسرے طبقوں کو نشانۂ ظلم و ستم بنایا جائے۔ ان کے نزدیک اقبال کا یہ طرزِ عمل زیادہ قابل گرفت
ہے، قابل گرفت اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کو سربلند ہونے کے لئے جو درس دیتے ہیں اس میں چھیننے جھپٹنے اور ٹو
ٹنے کے اسباق بار بار دہرائے گئے ہیں، یہ رجحان زمانۂ بربریت کی یادگار ہے اور اس بات کی دلیل بھی ہے کہ اقبال
جدید دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پوری طرح سمجھا نہیں، یا پھر سب کچھ سمجھتے ہوئے کسی خاص مصلحت کے تحت
سے روگردانی ہی مناسب سمجھی، اور وہ خاص مصلحت صاف ظاہر ہے۔ معترضین کا خیال ہے کہ محض طاقت ہی س
کچھ نہیں ہے۔ غلبہ پانے کے لئے کچھ دوسرے عوامل اس سے کہیں زیادہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر سوا
بڑی طاقت ہی کا ہے تو یہ جان لینا چاہئے کہ بعض بعض حالات میں ایک میٹھے بول کی کاٹ ہزار ہا تلواروں سے کہیں بڑھ
ثابت ہوتی ہے۔ طاقت کا اظہار بیشک اس بات میں بھی ہے کہ آبادیوں کو ویرانوں اور کشت زاروں کو شعلہ زاروں میں
تبدیل کر دیا جائے، بندگان خدا کے سروں کو تن سے جدا کر کے ان کے مینار کھڑے کئے جائیں اور ان کے گرد ایک وحش
رقص فرمایا جائے اور ہر وہ فعل روا رکھا جائے جس کے ارتکاب پر تہذیب و شرافت کی گردن بار ندامت سے دو
ہو کر رہ جائے۔ طاقت کا یہ اظہار یقیناً طرب آگیں ہے اور سرور بخش بھی لیکن اس کا خمار اتنا ہی اعضا شکن بھی ہے، ا
طریق کار کے برخلاف طاقت کے اظہار کا ایک دوسرا انداز بھی ہے جس کی بنیاد عدم تشدد اور تالیفِ قلوب رکھی گئی ہے
جو انسان کو احترام انسانیت کا درس دیتا ہے جو تہذیب کشی نہیں تہذیب پروری سکھاتا ہے۔ جو عورتوں کے سروں سے چا
کھینچ کر دیوانہ وار قہقہے لگانا نہیں سکھاتا بلکہ ان کے ماتھے پر تقدس و احترام کے زرکار آنچل ڈال دینا اپنا فرض منصبی سمجھتا
معترضین اس بات پر مصر ہیں کہ اقبال نے طاقت کے اس دوسرے رُخ کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا اور اگر کیا بھی تو بہت ہی سط
انداز میں، انھوں نے اسلام کے احیاء و عروج کے لئے سخت گیرانہ اقدامات کو ضروری سمجھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے م
کے ہاتھ میں تلوار تھمانا چاہی یعنی اس ہاتھ کا انتخاب کیا جو دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں خود ہی قریب قریب مفلوج ہو چکا تھا۔ چ
بفرض اس ریمارک کو انتہا پسندانہ قرار دیتے ہوئے اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان بازوؤں کی سختی و صلابت ہنوز بدست
قائم ہے تو بھی تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ انتخاب مناسب نہیں، دنیا ان بازوؤں کے وار کئی بار آزما چکی ہے۔ وہ لاکھ زو
فراموش سہی لیکن اس حقیقت سے بہر حال آگاہ ہے کہ مسلمان کی تاریخ عبارت ہے آگ اور خون سے جس کے پس منظر میں
نغموں کی نئے مدہم اور بہت ہی مدھم ہے۔ آہوں کی دھمک اور وحشیانہ قہقہوں کی جھنکار زیادہ اور بہت ہی زیادہ
اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس نے اپنے دور عروج و کامرانی میں کچھ تعمیرات بھی کی ہیں لیکن اس کی تخریب
کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع رہا ہے، اس کی تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کے ذوق خنجر آزمائی کی تسکین
لئے اگر کسی وقت اغیار کی کھیپ مہیا نہیں ہو سکی، تو اس نے بے دریغ اپنوں ہی کے حلقوم پر چھری رکھ دی۔ اس کا جذبہ انا
بار ہا بربریت کی انتہائی شکل میں نمودار ہوا جس کے نتیجے میں اس نے بغیر کسی معقول جواز کے بھی زندوں کو موت کی آغوش

ڈیا اور مدت کے مرے ہوؤں کو بے محابا قبر سے گھسیٹ کر سولی پر ٹانگ دیا یا سلگتی ہوئی چٹانوں پر سجا کر ہولی کا ایک
ہی ہولناک قسم کا سوانگ رچایا! ظلم و بربریت کے ان مناظر کے پہلو بہ پہلو غداری اور ضمیر فروشی کی مکروہ ترین مثالیں بھی
کے ذکر سے اس کی تاریخ کا کم و بیش ہر صفحہ داغدار ہے، اس بڑھ کر بھی ضمیر فروشی اور سنگدلی کیا ہوگی کہ ایک جانب
ہی جذب و ذوق کے ساتھ نانا کا کلمہ پڑھا جا رہا ہے۔ صبح و شام اس پر اور اس کی آل پر درود و سلام بھیجے جا رہے ہیں اور
طرف اس کے گرامی منزلت نواسے کا سر اتارا جا رہا ہے اور اس پر بھی جی ٹھنڈا نہیں ہوا تو اس کے جسدِ بے روح ذبے سر پر
ے دوڑائے جا رہے ہیں، اس کی زنانِ ذی احترام کے سروں سے چادریں کھینچی جا رہی ہیں اور اس کے اہل بیت کو طرح طرح
وا کیا جا رہا ہے۔ چشم فلک نے نگہہ عبرت سے اس ہولناک منظر کو دیکھا اور مبہوت رہ گیا۔ سعدی کے بقول اگر وہ اس حادثے
ں خون برساتا رہتا تو اسے بجا طور پر اس بات کا حق پہنچتا تھا۔

قوموں کی زندگی میں بعض اوقات بہت ہی نازک موڑ آ جاتے ہیں، ایسے مواقع پر ایک سرسری سی غلطی کا ارتکاب آگے
بڑے ہی دوررس نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ مسلمان کی اجتماعی زندگی میں ایسے بیسیوں موڑ آئے اور بیشتر ایسا ہو
اس نے اپنی بے خبری و بوالعجبیوں کی بدولت لمحات کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا اور ایسی صریح غلطیوں کا مرتکب ہوتا رہا
نتائج کے اعتبار سے انتہائی عبرت ناک ثابت ہوئیں۔ زمانہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتا، اس نے بالآخر اس کی لغزشوں کا
سے احتساب کیا۔ اس کے ذوق ہنگامہ آرائی کی دراز نفسیوں پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ اس کے اعمال و افکار پر اس کی
مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ اس کے دست گستاخ کی کلائی مروڑ دی گئی، تلوار چھوٹ کر دور جا گری اور یکبارگی
سوس ہوا گویا متاعِ لوح و قلم بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھوں سے چھین لی گئی۔

مسلمان کی اجتماعی زندگی میں نازک ترین موڑ غالباً یہی تھا، یہ ایک لمحۂ فکریہ تھا جس میں لازم تھا کہ اجتماعی اقدامات
رق ہائے کار کا تعین کیا جاتا، گزشتہ کوتاہیوں اور ناکردہ کاریوں پر سر پیٹنے کے بجائے آئندہ کے لئے ان کے سدِ باب
ریقے سوچے جاتے اور اس منصوبے پر غور کیا جاتا جو پوری ملی زندگی کی تعمیر نو کار کے لئے ناگزیر تھا۔ لیکن تکلف برطرف
مان سے ایسی حوصلہ افزا توقعات وابستہ کر لینا خود ہماری خوش فہمی کی دلیل ہے۔ جو ضرورت سے یقیناً بہت زیادہ ہے
لئے کہ ایسے نازک وقت میں بھی جبکہ وہ ذہنی اعتبار سے مکمل طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا اور اس کے اخلاقی قوی سکرات
لال کی آخری حدوں کو چھو چکے تھے۔ اس کے دل کے کسی چور گوشے میں ایک شوریدہ سر تمنا۔ بہر حال بیتاب و بے قرار تھی
وہ تھی لذتِ کام و دہن کی آزمائش سے متعلق —— لہٰذا اس تاریک ترین دور میں بھی جب اسے اپنی عظمتِ رفتہ
ش پر ضیافت اڑانے کو کچھ اور میسر نہ آیا تو اس نے اپنی ناکردہ کاریوں کی داد اس طریقے پر دی کہ اپنے نامور اسلاف کے
ے تک بیچ کھائے۔

اقبال پر شدت کے ساتھ اعتراض یہی ہے کہ اس نے کیا سوچ کر اس ترقی یافتہ دور میں انتہائی ترقی یافتہ قوموں کی سیادت
ت کے لئے مسلمان کو منتخب کیا جو اُس قوم کا فرد ہے جس کی تہذیب مدتیں گزریں دم توڑ چکی ہے جس کے اخلاق کو گھن
ہوئے صدیاں بیت گئیں ہیں، جس کی علمی صلاحیتیں مفلوج اور جس کی سائنسی سوجھ بوجھ صفر کے برابر ہے۔ جسے اپنی عبرتناک
کم مائیگی کے سبب اس ترقی یافتہ دور میں زیادہ سے زیادہ تیسرے درجے کی ذہنیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کی دورِ
کی نادانیوں کی یاد سے آج بھی انسانیت کے اعصاب پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

اقبال کا نظریہ طاقت بھی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے، کہا جاتا ہے کہ حصول طاقت کے معاملے میں اقبال نے ضرور
سے زیادہ غلو کیا ہے۔ اس معاملے میں اس نے لینن اور مسولینی جیسے جابروں کی ظاہری و باطنی خباثتوں کو نظر انداز کر
ان کے طریق ہائے کار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ حد یہ ہے کہ ابلیس و آدم کے واقعہ میں بھی اُسے ایک خاص قسم کی
نظر آئی، ابلیس کا عمل اُسے حسنِ عمل دکھائی دیا۔ قرآن حکیم میں اس واقعہ کا ذکر اخلاقیات سے علاقہ رکھتا ہے۔ جس
نظم و ضبط سے ہے جسے عرف عام میں شیوۂ تسلیم و رضا بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اقبال نے اسے خالص اپنے نقطۂ نظر
اسے ابلیس کی سرکشی میں اس کے شخصی بانکپن اور اس کی دلآویز انا کی جھلک نظر آئی جس سے موقع و محل کی مناسبت کو
رکھتے ہوئے اتفاق ممکن نہیں۔

اقبال اور کلامِ اقبال پر اعتراضات کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن سردست صرف انہی پر اکتفا کیا جاتا
حقائق کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ اعتراضات اپنی جگہ خاصے وزنی ہیں۔ بنابریں ہمارے لئے
کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا کہ ہم اپنی برأت میں یہ کہہ دیں کہ اقبال کا مطمح نظر مسلمان نہیں بلکہ اسلام اور صرف اسلام
مسلمان تو امرِ اضافی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تاویل بڑی حد تک درست بھی ہے۔ اس لئے کہ اقبال نے مسلمان کی
صرف اس وجہ سے کی ہے کہ وہ بہرحال وہ اسلام کا نام لیوا تو ہے۔ اسلام سے اس کی عقیدت زبانی ہی سہی ہے تو سہی
اقبال کے نقطۂ نظر سے ایک تحریک ہے جس کا مقصد کائنات میں ترویج خیر و برکت کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ ظا
کہ کسی بھی تحریک کو چلانے اور منتہائے کمال تک پہنچانے کے لئے ایسے لوگوں کی معاونت درکار ہے جن کا جذبۂ سرفر
جاں نثاری اس تحریک کے لئے بال و پر کا کام دے سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ کسی اور مسلک کے ماننے
کو اس تحریک سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اس کی باگ ڈور بجز ان لوگوں کے جو اس کے ساتھ ایک قسم کی عق
وابستگی رکھتے ہیں کسی اور کے سپرد نہیں کی جا سکتی تھی۔ اقبال اس دور کے مسلمان کی اخلاقی گراوٹ سے بے خبر نہیں۔
یہی وجہ ہے کہ وہ اسے راہ عمل میں گامزن ہونے سے پہلے صداقت و شجاعت کا درس دیتا ہے۔ اخوت و مرو
کے رموز سے آگاہ کرتا ہے اور قہاری کے ساتھ ساتھ غفاری و قدوسی کے حقائق و اسرار سمجھاتا جاتا ہے۔ قہاری بہرحا
ہے اس لئے کہ باطل قوتوں کی سرکوبی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن اقبال بے لگام قہاری کا قائل نہیں ہے اس نے ا
آداب کی نشان دہی کر دی ہے جو حرب و ضرب کے معاملے میں اسلام نے قائم کئے ہیں، اس نے ان خطوط کو کچھ او
کر دیا ہے جو اعمال و احتساب کے باب میں فاتح اور مفتوح کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتے ہیں۔ اقبال اس
بہت ہی اہمیت دیتا ہے، لہٰذا جب وہ اس کے باطنی جوش کو ابھارتا ہے اس کی پوشیدہ قوتوں کو اشتعال دلاتا
جانتا ہے کہ وہ ایک سیل تندرو کی شکل اختیار کر جائے تو ساتھ ہی کوہ و بیاباں کی تخصیص بھی کر دیتا ہے۔ گل و گ
کا قرب چونکہ اس تندروی کا متحمل ہونے سے قاصر ہے لہٰذا ایسے مقامات پر وہ اُسے جوئے نغمہ خواں کی صورت
خرامی کے ساتھ گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔ مسلمان سے اقبال کی مراد ہرگز وہ مسلمان نہیں ہے جس کا مسلک لوٹ
رہزنی اور بے رحمانہ قتل و غارت گری ہے، اقبال کا مسلمان مرقع ہے ایثار و جاں نثاری کا، وہ مجسمہ ہے سرفر
اور بے مثال بہادری کا جس میں اولوالعزمیوں کے پہلو بہ پہلو اخلاق کی خوش ادائیاں اپنی مکمل سحر کاریوں
کے ساتھ موجود ہیں۔

اقبال کا خیال تھا کہ غلامی کی فضا میں رہ کر سیرت و کردار کی صحیح نشو و نما ممکن نہیں اس مقصد کے حصول کے لئے
کھلی کھلی فضا درکار ہے لہٰذا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ اس نے ہندی مسلمانوں کے لئے ایک آزاد سرزمین کا خواب
تادیبِ نفس اور تربیتِ اخلاق کی تحریک کو اجتماعی حیثیت سے فروغ دیا جا سکے۔ اقبال نے تمثیلی پیرائے میں
غلامی میں زندگی سمٹ کر جوئے کم آب کی مانند حقیر و بے مایہ سی رہ جاتی ہے۔ اور اس کے برخلاف آزادی کی نعمت
ہو کر اس کی حیثیت بحرِ بے کراں کی سی ہو جاتی ہے۔ اقبال کا یہ خواب کہ ہندی مسلمانوں کے لئے ہندوستان ہی میں ایک علیحدہ
دیا جائے بہر کیف شرمندۂ تعبیر ہو چکا ہے اور اس بات کو کم و بیش اٹھارہ برس گزر چکے ہیں، قوموں کی زندگی میں یہ مدت
تو نہیں ہے، لیکن بحالتِ موجودہ جبکہ زندگی خود ہزار ہا میل فی ساعت کے اعتبار سے گردش کر رہی ہے ایسی کچھ کم بھی نہیں
نیز مقتضائے وقت کے عین مطابق ہو گی اگر اس موقع پر ہم قدرے غیر جانبدارانہ انداز میں اپنے اعمال کا جائزہ لیں
حقیقت کو خاص طور پر پرکھیں کہ اس تمام عرصے میں ہمارے احساس و شعور نے پختگی و بالیدگی کی کتنی منزلیں طے کی ہیں،
کے بقول ہماری زندگی جو دورِ غلامی میں سمٹ کر جوئے کم آب کی مانند رہ گئی تھی، اس آزادی کی کھلی کھلی فضا میں رہ کر
بحرِ بے کراں ہونے کی کتنی واضح علامات پیدا ہوئی ہیں۔ اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نزاکت احساس بھی ایک
سماج میں ایک عام اعتماد کی سی فضا کے قیام و بقا کے لئے اس کا احترام و لحاظ قطعی ناگزیر ہے۔ یہاں اس حقیقت
نی کرا دی جائے تو نامناسب ہو گا کہ قیام پاکستان کی تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس کے ساتھ بہ استثنائے چند
دس کروڑ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنیں وابستہ تھیں۔ اس نونہال آرزو کو سینچنے کے لئے جس سرچشمے کی تلاش
کی سوت بلاشبہ دلوں سے پھوٹتی ہے۔ اسے زندگی عطا کرنے کے لئے جس آبِ حیات کے چھینٹے دیئے گئے وہ
جگر کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ مختصراً یہ ملک پوری مسلمان قوم کی اجتماعی جاں فشانیوں کا ثمرہ ہے۔ اس کا قیام
ص خطے یا طبقے کی کوششوں کا مرہونِ منت نہیں ہے اس بنا پر اس پر کسی خاص خطے یا طبقے کو بلاشرکت غیرے
کا استحقاق بھی نہیں پہنچتا۔ اقبال بتانِ رنگ و خوں کی پرستش کا قائل نہیں، وہ اس قبا ملانہ بلکہ جاہلانہ ذہنیت
آیا تھا۔ وہ طبقاتی سوچ کا ازلی دشمن ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ لعنت ہے جو اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والی
اس تصور کو پارہ پارہ کرنے والی ہے جس پر اس ملک کا قیام میں عمل میں لایا گیا ہے۔ طبقاتی ذہنیت ہر اعتبار سے
ہے۔ یہ قومی ذہانت کو پنپنے اور پروان چڑھنے کے تمام راستے مسدود کر دیتی ہے۔ یہ چیز نااہلی کو فروغ دیتی ہے،
وجہ سے معاشرتی ناانصافیاں عام ہو جاتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں انتقامی جذبات
چڑھنے لگتے ہیں جو کسی وقت بھی شدید ردِ عمل کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اور ایسا ہونا فطرت انسانی کے عین
ہے، ایک صاحبِ نظر کے بقول "۔ کائنات میں خلفشار کی چنگاری اس وقت بھڑکی ہے جب لوگوں نے
کے جائز حقوق غصب کرنے کی کوشش کی ہے" قرآن کے الفاظ میں یہ طریق ہائے کار ان قوموں کا ہوا کرتا
صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی ہوا کرتی ہے۔ خدا کا قہر صرف اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ آسمان ہی سے آگ برسائی
لوگوں کے دلوں کا آپس میں ایک دوسرے سے پھٹ جانا اور نتیجے کے طور پر ان کا طبقوں اور ٹکڑیوں میں بٹ جانا
خداوندی ہی کی ایک شکل ہے۔ اسی طرح قوموں کے صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے سے صرف یہی مفہوم متبادر نہیں ہوتا
ثمود کی تاریخ ہی دہرائی جائے، قوموں کی برادری میں کسی قوم کے اعتماد کا مجروح ہو جانا۔ اس کی ساکھ کا

ختم ہو جانا بھی اُس کے صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے کی دلیل ہے ۔ قومی یکجہتی کے جس خواب کو اقبال نے دیکھا تھا، وہ اپنی حدود میں بہت ہی دل آویز تھا۔ قومی یکجہتی کو پروان چڑھانے کے لئے جس گوشۂ عافیت کی تمنا اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی ، وہ بھی بہر کیف میسّر آگیا ہے اور یہ بات یقیناً بہت ہی خوش آئند ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بہر طور ذہن میں رہے کہ اس عظیم کامیابی کے بعد ہماری قومی و ملّی زندگی ایک انتہائی آزمائشی مرحلے میں داخل ہوگئی ہے ۔ حقیقی منزل مراد ابھی دور ہے ، وقت کا تقاضا ہے کہ شمع بصیرت کی لو کو ذرا اونچا اٹھایا جائے تاکہ رہ گزار شوق کے اندھیرے کچھ چھٹ سے جائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ کاروانِ فکر و نظر کسی وقت بھی گم کردہ راہ ہو کر دشتِ ظلمات کی پر خطر رہ گزار دں میں بھٹک جائے اور حیات ملّی کا وہ تابناک مستقبل جو ایک مدت سے ہمارے گہوارۂ تخئیل میں ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریکیوں میں ڈوب جائے ۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ ہماری توقعات کو صدمہ پہنچائے گی بلکہ نظریات اقبال کی صداقت کو بھی براہ راست صدمہ پہنچائے گی اور یہ ضرب بالواسطہ طریقے پر خود اسلام کی قوتِ اتحاد کے نظریے کو زخم پہنچانے کے مصداق ہوگی ۔ یہاں اس بات کا اعادہ کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ وہ عظیم مقصد جس کے لئے اس ملک کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اگر پورا نہ ہوسکا تو اس کا لازمی طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ معترضین جواب تک قدرے شائستہ انداز میں نظریات اقبال کی گرفت کرتے رہے ہیں کیا تعجب ہے کہ بے محابا اقبال کی بصیرت کا مضحکہ اڑانے لگیں ۔ لہٰذا اس نازک موڑ پر ہماری یہ اجتماعی ذمہ داری ہے کہ ہم حقیقت پر غور کریں کہ اقبال جسے ہم اپنا قومی شاعر قرار دیتے ہیں اور اس کے واقف کار اس کے مدعی بھی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک ہماری عظمت و فلاح کی آرزو میں برابر تڑپتا رہا ہے کیا ہمارے لئے یہ بات مناسب ہوگی کہ ہم اپنی ناکردہ کاریوں کے سبب اُس سے اس کے اس بے مثال خلوص کا اتنا بھیانک انتقام لیں ؟

خریداران "نگار"

"جدید شاعری نمبر" سالنامہ ۱۹۶۵ء

۱۔ جو ۱۵ جولائی ۶۵ء کو شائع کیا جارہا ہے ، تقریباً ۳۰۰ صفحات پر محیط ہوگا اور بعض نہایت بیش بہا مضامین اس میں ہوں گے ۔ کوئی مضمون ناقص و نامکمل نہ ہوگا۔ حسب معمول یہ خصوصی شمارہ بھی عام ڈاک سے بھیجا جائے گا لیکن جو حضرات اسے رجسٹری سے منگوانا چاہیں تو ۷۵ پیسے کے ٹکٹ (مصارف رجسٹری) ضرور بھیجیں ورنہ سالنامہ گم ہو جانے کی صورت میں دوبارہ ارسال نہ کیا جائے گا ۔

۲۔ "جدید شاعری نمبر" جولائی و اگست ۶۵ء کا مشترک شمارہ ہوگا اور اگست کا پرچہ الگ شائع نہ ہوگا ۔

(ادارہ)

باب المراسلہ والمناظرہ

اسلامی قوانین

ب علی مقصود صاحب - ایڈوکیٹ کراچی)

آج کل اسلامی قوانین کو نئے سرے سے رواج دینے پر بہت زور دیا جارہا ہے - ہر پلیٹ فارم سے یہی شور اٹھتا ہے کہ ین بھی اسلامی قوانین نافذ ہونا چاہیئے - بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ گورنمنٹ کی مخالف جماعتیں اور وہ گروہ جو بظاہر گورنمنٹ واہیں - دونوں اس مسئلہ میں متفق ہیں - البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک دوسرے کے طریقہ کار میں فرق ہو - اب مسئلہ یہ ہے کہ آخر اسلامی ں سے مراد کیا ہے ؟ اور ان کا عملدرآمد کس طرح کیا جا سکتا ہے - اس مسئلے میں ہر شخص ایک دوسرے سے اختلاف رائے رکھتا وئی دو شخص مشکل ہی سے ایسے ملیں گے جن کی رائے اس مخصوص مسئلہ میں ایک ہو -

میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو محض جذبات سے کام لیتے ہیں اور وہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسی مسئلہ کو ایک سیاسی کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور غالباً دونوں صحیح مقام سے ہٹے ہوئے ہیں -

ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کا نقطہ نظر ایک حد تک ایمانداری پر مبنی ہے مگر یہ قانون کو محض ایک منجمد (STATIC) چیز ے ہیں - ان کے خیال میں اب ہمیں قانون کو تبدیل کرنے کا حق ہی نہیں اور یہ حق نہ کسی فرد کو حاصل ہے نہ کسی جماعت کو - ون کے خیال میں قانون ایک ایسا سربند چشمہ ہے جس میں تازہ پانی پہنچے یا گندہ پانی نکالنے کے لئے کوئی راستہ نہیں - ں تک کہ سول قوانین کا تعلق ہے ان کا رواج تو اب بھی موجود ہے اور ایسے قوانین کا عملدرآمد آج بھی اسلامی قوانین کی ردوں پر ہوتا ہے - انگریزی حکومت کے دور میں ہمارے (PERSONAL LAWS) کو برقرار رکھا گیا - البتہ کہیں ں مخصوص حالات کے ماتحت ضابطہ میں قدرے تبدیلیاں کی گئیں - وراثت - ولایت - نکاح ، طلاق اور ایسے ہی دیگر وانین بدستور سابق اپنی جگہ پر قائم رکھے گئے - البتہ فوجداری یا یوں کہئے کہ جرم و سزا کے قوانین بالکل بدل دیئے گئے اور وہ اس لئے کہ ان کا عملدرآمد پورے ملک پر یکساں ہو سکے - اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ دور میں جرم و سزا کا نظریہ تقریباً بدل چکا ہے - اور جرم کے ثابت کرنے کے لئے ایک ضابطہ بنایا گیا ہے جس پر عمل ضروری ہے - بغیر اسکے مجرم کے خلاف جرم ثابت کرنا نہیں ہے - پھر اس کے علاوہ قانون شہادت نے جو کہ صدیوں کی دماغی کاوشوں کا نچوڑ ہے - کچھ ایسے اصول وضع کئے ہیں ،

جن کو سامنے رکھ کر بڑی حد تک صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

انگریز والے نے اگر کوئی چیز اپنے دور حکمرانی میں دی تھی وہ بھی RULE OF LAW تھا جس کو اب ہم خود ملیامیٹ کئے دے رہے ہیں۔

میں نے جب کبھی اس موضوع پر لوگوں سے گفتگو کی ہے تو میں نے یہی دیکھا ہے کہ ان کی بحث کا موضوع زیادہ تر قوانین فوجداری سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ ہمارے تعزیرات کو بدل کر پرانے اسلامی ڈھنگ پر ڈھال دیا جائے۔ بظاہر اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ایسا کرنا ضروری ہے بھی یا نہیں۔ اور ممکن بھی ہے یا نہیں اور اگر ایسا کر دیا گیا تو کیا جرائم میں کچھ کمی ہو جائے گی۔ یا ایسا کرنے میں کوئی بڑی اسلامی خدمت ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں میری حقیر رائے یہ ہے کہ اب اس دور میں جبکہ سائنس زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہو گئی ہے اور روز بروز ہمارے سامنے نئے نئے میدان سر کئے جا رہے ہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارے قوانین جوں کے توں باقی رکھے جائیں جو اب سے تقریباً تین ہزار سال پہلے وضع کئے گئے تھے (میری مراد قانون موسوی سے ہے) اور ان میں کوئی تبدیلی حالات حاضرہ کی روشنی میں نہ کی جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ولایت کا سفر تو ہوائی جہاز سے ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کریں اور قاتل کو بجائے پھانسی کے برسر راہ سنگسار کریں اور چور کا ہاتھ کاٹ ڈالیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی قوم کی تمدنی ترقی کا اندازہ اس کے قوانین سے لگایا جا سکتا ہے اور موجودہ دور میں ہر ترقی یافتہ قوم اپنے قوانین حالات کے مطابق ڈھالتی رہتی ہے۔ یہ کوئی عقلمندی نہ ہوگی کہ مسلمان دوسرے شعبوں میں تو ترقی کریں لیکن اپنے قوانین کو تبدیل نہ کریں۔ محض اس لئے کہ ہمارے خیال کے مطابق ان کا تبدیل کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

اسلامی قوانین کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیادیں تقریباً کچھ رد و بدل کے ساتھ شریعت موسوی ہی ہیں اور اگر ضد اور ہٹ سے علیحدہ ہو کر دیکھا جائے تو لازمی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ بہت سے قوانین ایسے تھے جو زمانہ حال کے لئے مناسب نہیں۔ اور موجودہ دور میں بہت سے قوانین ایسے ہیں جن کی تنسیخ سے معاشرہ میں بہت کچھ گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔ میں اس سے منکر نہیں کہ جس دور میں وہ قوانین نافذ کئے گئے تھے وہ اس زمانے کے معاشرے کیلئے یقیناً صحیح ہوں گے اور ان کا عملدرآمد بھی صحیح طور پر ہوتا ہو گا مگر یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس شے کو ہم ISLAMIC JURIS PRUDENCE کہتے ہیں وہ تو تقریباً دوسری صدی ہجری کے بعد DEVELOPE ہوئی حالانکہ اُن کی بنیادیں اُس سے قبل پڑ چکی تھیں۔

اس وقت یہ مسئلہ کچھ ایسا الجھا ہوا ہے کہ جس کو سلجھانے کے لئے ایسے مخصوص حضرات کی ضرورت ہے جو موجودہ دور کے مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر ایسے قوانین وضع کریں جو زمانے کا ساتھ بھی دے سکیں اور ساتھ ساتھ اس کا لحاظ بھی رکھیں کہ سوسائٹی بالکل زنجیروں میں جکڑ نہ جائے یا جس کے نتیجے میں ترقی کی راہیں مسدود نہ ہو جائیں۔

آجکل صورت حال کچھ ایسی ہے کہ ایک گروہ تو آنکھ بند کر کے یہ چاہتا ہے کہ جلد از جلد اسلامی قوانین کا نفاذ کر دیا جائے یہ گروہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ کام کیسے ہو سکتا ہے اور اس سلسلے میں کچھ ہو بھی گیا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ میں شاید اس سے قبل بھی نگار میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کر چکا ہوں کہ یہ کام آسان نہیں ہے اس میں ہزاروں دقتیں بھی ہیں اور پھر یہ ضروری نہیں کہ کوئی خاص فوائد مرتب ہو سکیں۔ بہت سے قوانین اگر آج منسوخ کر دئے جائیں تو اس سے سوائے نقصان

ی فائدہ نہیں۔ ایک مثال دیتا ہوں یعنی یہ کہ مطابق شرع اسلام قتل کا الزام خون بہا دیکر compound کیا جاسکتا یعنی قتل قابل راضی نامہ ہے۔ حالانکہ اکثر چھوٹے جرائم قابل راضی نامہ نہیں یعنی زنا کی سزا موت ہے۔

ہمارے معاشرے کی حالت کا اندازہ اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب سے چند سال پہلے مارشل لا کے یں ایک قانون بنایا گیا تھا جسکو عائلی قوانین کہتے ہیں۔ اگر انصاف کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس قانون میں بہت سی یں ایسی تھیں جن پر عمل کرنے سے معاشرہ کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ حالانکہ اس پر عملدرآمد کا ضابطہ ایسا بنا ی پر مجھے شدید اختلاف ہے۔ مگر جہاں تک قانون کا سوال ہے مجھے اس میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو اسلام سے ٹکراتی یکن اس قانون پر جو واویلا ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور مسلمان آج بھی بے ضرورت نکاح اور بلا وجہ طلاق پر مصر ور اس کو خدا کا دیا ہوا حق سمجھتا ہے۔

ابھی چند روز ہوئے نئے وزیر قانون نے نئے سرے سے دانہ ڈالدیا اور یہ کہہ دیا کہ جلد از جلد سارے قوانین کو می ڈھانچے میں ڈھال دیا جائے گا۔ اس کے اس GESTURE سے بہت سے لوگ خوش ہوئے ہوں گے۔ لیکن ھے سادے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور خود محترم منسٹر کے لئے کتنا بڑا دردسر ہو سکتا ہے۔

اب میں اس سلسلے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اسلامی قوانین کا نفاذ حالات حاضرہ کے ماتحت ممکن یا نہیں اور اگر اس کو ممکن بنایا بھی گیا تو اس سے کچھ اسلام کی بہتری بھی ہو گی یا نہیں۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے کہ جب اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں گے تو مسلمان غیر مسلم پر جزیہ لگانا ی ضروری سمجھیں گے۔ اگر مولوی صاحب سے یہ سوال کیا جائے تو ان کا جواب تو مجھے معلوم ہے کیونکہ اس کے تخیل سے MODERN STATE کا تصور بہت دور ہے حالانکہ اب ذمی کوئی نہیں۔ ہر شخص ایک ملک میں برابر کا شریک ے چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔

(نگار) آپ نے ایک ایسے مسئلہ پر توجہ فرمائی ہے جو واقعی بڑا اہم ہے لیکن اسی کے ساتھ حد درجہ پیچیدہ بھی۔ اہمیت تو اس کی ظاہر ہے کہ عدلیہ کا سارا نظام اسی پر منحصر ہے اور پیچیدگی یہ ہے کہ علمی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد اس ت جتنے نظریے جرم و سزا کے باب میں متعین کئے گئے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ متنازع فیہ ہیں بلکہ عملی حیثیت سے دشوار ب بھی ہیں۔

جرم کوئی نئی چیز نہیں ہے اس کا وجود اس وقت سے پایا جاتا ہے جب انسان نے اول اول دنیا میں قدم رکھا اور توں کی پیش گوئی کے مطابق اس حد تک جھگڑالو، ظالم و خونریز پیدا ہوا تھا کہ اس کی دنیاوی زندگی کا آغاز ہی قتل و فساد سے ا جسے روایتی زبان میں "ہابیل و قابیل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جرم نام ہے کسی شخص کے جانی، مالی و معاشرتی حقوق کو چھین لینے یا ضایع کر دینے کا اور سزا نام ہے اس جذبۂ انتقام تسکین یا تلافی نقصان کا جو مظلوم و محروم کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اول اول جب کوئی عائلی نظام قائم نہ ہوا تھا تو جرم و بالکل انفرادی حیثیت رکھتے تھے اور اس کا تعلق محض ذاتی قوت و شہامت سے تھا۔ نہ جرم کی کوئی حد بندی تھی نہ انتقام انسان اسی طرح کٹتا مرتا رہا۔ بعد میں جب عائلی و قبائلی نظام قائم ہوا تو یہ بات شیوخ قبائل سے متعلق ہو گئی اور سزا کا مسئلہ

ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ جو سزا مناسب سمجھتے تھے تجویز کر دیتے تھے۔ کوئی خاص قاعدہ یا قانون مقرر نہ تھا۔
اس کے بعد جب حکومتیں قائم ہوئیں تو سزا د تعزیر کا مسئلہ انفرادی انتقام کے علاوہ اجتماعی نظام سے بھی متعلق ہو گ
اس کے لئے قواعد و ضوابط بھی منضبط کئے گئے، جن میں تخویف و ترہیب کو بھی سامنے رکھا گیا۔ اور اس طرح سزا کی بنیاد
چیزوں پر قائم ہوئی، ایک انتقام انفرادی اور دوسرا انتقام قومی تاکہ لوگ آیندہ ڈر کر ارتکاب جرائم سے احتراز کریں۔
الغرض اسی اصول پر مختلف ممالک و اقوام میں قوانین تعزیر وضع ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے آخر
اس مسئلہ پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی غور کیا جانے لگا اور سزا کے مختلف نظریے قائم کئے گئے۔
پہلا نظریہ اتفاق اجتماعی کا ہے جس کو سب سے پہلے روسو نے وضع کیا۔ یعنی یہ کہ جب انسان نے انفرادی نظام
ہٹ کر ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) کی تشکیل کی تو سوسائٹی کو گویا اس کا اختیار بھی دے دیا کہ وہ جو سزا مناسب سمجھے مجرم پ
کرے۔ لیکن اس نظریے کے حدود بھی جذبۂ انتقام کے حدود سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے بعد بنتھام نے مفاد عام اور راحت
معاشرہ کو سامنے رکھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ مجرم دراصل ہیئت اجتماعی کا دشمن ہے۔ لیکن اس نظریے میں بھی کوئی نئی با
بھی بلکہ اعادہ تھا اسی اصول تخویف و ترہیب ہی کا اور اسی کے پیش نظر متعدد قوانین وضع کئے گئے جن میں فرانس کا ق
جرائم جو ۱۸۱۰ء میں بزمانہ نپولین وضع کیا گیا تھا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔
تیسرا نظریہ عدل مطلق کا ہے یعنی ایک مجرم کو اس لئے سزا نہیں دی جاتی کہ وہ ہیئت اجتماعی کو نقصان پہنچاتا
بلکہ اس میں محض نفس جرم کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یعنی جرم جتنا زیادہ سنگین ہو اور اخلاق و مفاد عامہ کے خلاف ہو
ہی سخت سزا مجرم کو ملنا چاہیئے۔ اس نظریے کا قدیم ترین واضع افلاطون تھا جس کی تائید جرمن فیلسوف کانٹ نے
کی۔ لیکن یہ نظریہ بھی نقص سے خالی نہیں کیونکہ بعض جرم ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اصول اخلاق کے تو خلاف ہیں لیکن
اجتماعی کو ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔
ایک چوتھا نظریہ اور ہے جسے فرانس کے فلاسفر کوزن اور جیزو نے پیش کیا ہے وہ یہ کہ ہیئت اجتماعیہ کو
حاصل نہیں ہے کہ وہ مجرم کو حد انصاف سے زیادہ سزا دے یا سزا مناسب حدود سے تجاوز کر جائے۔ اس نظریے کے م
فرانس کے تعزیری قوانین میں بہت کچھ ترمیم بھی کی گئی لیکن اس میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ مجرم کی ذاتی وجاہت و اہم
کو بھی سامنے رکھا جاتا تھا اور سزا میں کافی تخفیف ہو جاتی تھی جو نظریۂ عدل و مساوات کے بالکل منافی ہے۔
اس کے بعد علم الحیات کے نقطۂ نظر سے بھی اس مسئلہ پر غور ہونے لگا اور علماء حیاتیات نے یہ نظریہ پیش کیا
کہ ہیئت اجتماعی بھی ایک زندہ جسم کے مشابہ ہے۔ جس کی حفاظت ہر شخص کا فرض ہے اور کسی مجرم کو سزا دینا دراصل سو
ہی کی حفاظت ہے۔ لیکن اس کا تعلق بھی دراصل اسی نظریۂ تخویف سے ہے۔
اس کے بعد اطالوی لومبروزو نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جرم کے ارتکاب میں فطری مجبوری کو بھی دخل ہے کیونکہ م
کی نہ صرف ذہنیت بلکہ جسمانی ساخت بھی عام انسانوں کی فطرت و ساخت سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ چور
ہاتھ لمبے اور قاتل کے چھوٹے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اول تو لومبروزو کا یہ نظریہ خود علمی نقطۂ نظر سے مح
ہے اور دوسرے یہ کہ اس صورت میں انسان کے ذاتی ارادہ کا سوال بالکل ختم ہو جاتا ہے اور تعزیر کی ضرورت
باقی نہیں رہ جاتی۔

اب علمارِ اجتماعیات کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا خیال اس باب میں ان سب سے مختلف ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ جرائم کا سبب وہ ماحول ہے جس میں انسان تربیت پاتا ہے اور یہ نظریہ اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک معقول بھی ہے: چنانچہ حال میں اسی حقیقت کے پیش نظر سزا سے زیادہ مجرمین کی ذہنی اصلاح کو سامنے رکھا جاتا ہے اور قید خانوں کے نظام میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

اب آئیے غور کریں کہ اسلام کے تعزیری قوانین کی نوعیت کیا ہے اور متذکرۂ بالا نظریوں میں سے کس نظریہ کو اس نے رکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام نے زیادہ تر شریعت موسوی سے استفادہ کیا ہے اور اصولاً نظریہ عدل ہی کو سامنے ہے۔ ملاحظہ ہو تعزیر کا بنیادی اصول:۔

"ان النفس بالنفس والعین بالعین، والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص۔"

(یعنی جی کا بدلا جی ہے، آنکھ کا بدلا آنکھ ہے، کان کا بدلا کان ہے، دانت کا بدلا دانت ہے اور زخموں کا بدلا زخم)

قصاص کا مفہوم دراصل وہی ہے جسے انگریزی میں TIT FORTAT کہتے ہیں اور یہی اصول شریعت موسوی میں قائم تھا جس سے اسلام نے استفادہ کیا۔ لیکن کافی اصولی تغیر و تبدل کے بعد اور صرف ان جرائم کو موجب تعزیر قرار دیا جو سوسائٹی یا حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترک نماز۔ ترک صوم کتنا بڑا گناہ ہے لیکن اس کو مستوجب تعزیر قرار نہیں دیا۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شخص دوسرے کا ایک پیسہ بھی چھین لے یا چرالے تو اس کو سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اس لئے کہ ترک صوم و صلوٰۃ کسی کا حق تلف نہیں ہوتا اور چوری سے خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہو دوسرے کا حق غصب ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام کا نظریہ جرم و سزا کے باب میں شخص و ذات سے اتنا تعلق نہ تھا۔ جتنا مصالح معاشرہ سے۔ اب رہا یہ سوال کہ اسلام نے عقوبت یا سزا کے جو طریقے رائج کئے وہ فی نفسہٖ کیسے ہیں اور آیا عہد حاضر میں بھی ان پر عمل کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ آج کل تعلیم یافتہ جماعت کا خیال یہ ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین عہد وحشت کی یادگار ہیں اور اس وقت کی شائستہ و مہذب دنیا ان کی تائید نہیں کر سکتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصور صحیح نہیں اور یہ خیال صرف اس لئے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے کہ ان کے سامنے ان قوانین کی روح اور ان کے صحیح طریق نفاذ کو پیش نہیں کیا گیا۔ عقوبت کے باب میں اسلام نے سب سے پہلے یہ اصول پیش کیا ہے کہ جزاءُ سیئۃ، سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ" اس میں برائی کی سزا کو بھی برائی ہی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی سزا بالکل آخری درجہ ہے اصلاح کا اور اسی لئے اس سے بچنے کے لئے اس سے بہتر عفو و درگزر کی صورت بھی پیش کر دی ہے۔ اسی اصول کو سورۂ نحل میں پھر اسی طرح پیش کیا گیا ہے، (وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم ولئن صبرتم فھو خیر للصابرین) یعنی اگر مدعی جرم کو معاف کر دے تو زیادہ ثواب کی بات ہے۔

لیکن اگر وہ عفو و درگزر سے کام لینا پسند نہیں کرتا تو پھر پاداش صرف بہ اندازۂ ضرر ہو گی۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام تعزیرات کے باب میں کتنا معقولیت پسند واقع ہوا ہے جس پر ہم آئندہ صفحات میں زیادہ وضاحت سے بحث کریں گے۔

اسلام کی وہ تعزیرات جن کے قبول کرنے سے عہد حاضر کا انسان ابا کرتا ہے اور جن کا ذکر ہمارے فاضل مرا نگار نے بھی کیا ہے صرف تین ہیں (۱) چور کے ہاتھ کاٹ ڈالنا (۲) زنا کے مرتکب کو سنگسار کر دینا (۳) قتل جرم کو قابلِ راضی نامہ قرار دے کر دیت دخون بہا کی رقم لے کر رہا کر دینا۔

اسب سے پہلے ہم قتل کے مسئلہ کو لیتے ہیں جس پر فاضل مقالہ نگار کا یہ اعتراض ہے کہ اسلام نے اسے قا راضی نامہ جرم قرار دید یا ہے۔ اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر مقتول کے ورثا، بجائے قصاص کے دیت، یا خونبہا لینا پسند کریں قاتل کا قصاص رک دیا جائے گا، لیکن اس کو ہم راضی نامہ تو نہیں کہہ سکتے، کیونکہ قاتل کو تو بہر حال سزا مل گئی۔ جان نہ سہی مال کی۔ اب رہا یہ امر کہ قاتل کے لئے کیوں یہ سہولت پیدا کی گئی تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مقتول تو قاتل کے قصاص کے بعد بھی دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا اور جو نقصان مقتول کے ورثا کو پہنچا ہے اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے مالی مدد سے اُن کے آنسو پونچھ دئے جائیں۔ اور قصاص کی صورت میں اس کا امکان نہ تھا۔ علاوہ اس کے دو پہلو یہ بھی ہے کہ اگر قاتل کا قصاص بہر حال ضروری قرار دیا جاتا تو ایک گھر اور تباہ ہو جاتا۔ برخلاف اس کے دیت خونبہا کی صورت میں دونوں گھر ایک حد تک تباہی سے بچ جاتے ہیں۔

اس موقع پر یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ دیت دخونبہا کی ادائی چونکہ زیادہ مشکل بات نہیں اس لئے اس سے انسداد قتل میں مدد نہیں مل سکتی، بلکہ ہر وہ شخص جو دولتمند ہے قتل میں جری ہو جائے گا اور روپیہ دے کر قصاص سے بچ جایا کرے گا۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ دیت دخوں بہا قبول کرنا تو مقتول کے ورثا کا کام اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو قاتل کسی طرح قصاص سے بچ نہیں سکتا۔ رہا سوال انسداد قتل کا ترہیب و تخویف کے ذریعہ سے، سو اس کے جواب میں، صرف اس قدر عرض کروں گا کہ جن ممالک میں دیت دخوں بہا کا رواج نہیں۔ بلکہ قاتل کا قصاص ضروری ہے، وہاں جرائم قتل میں کتنی کمی ہو گی۔

اسلام کے تعزیری قوانین میں چور کے ہاتھ کاٹ ڈالنے کی سزا البتہ بہت سخت ظاہر کی جاتی ہے اور درا ہے بھی ایسی ہی۔ لیکن اس باب میں اکثر حضرات سخت غلطی کا شکار ہیں اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مطلق چوری خواہ ا نوعیت کچھ ہی ہو قطع ید کو مستلزم ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔

کلام مجید کی وہ آیت جس میں چور کا ہاتھ کاٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ ہے۔

"السارق والسارقۃ فاقطعوا اید یھما"

یعنی چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو ــــ لیکن اس کے بعد کی آیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں،

"فمن تاب بعد ظلمہٖ واصلح فان اللہ یتوب علیہ

یعنی اگر کوئی سارق ارتکاب جرم کے بعد توبہ کرے یا معافی مانگ لے تو اللہ اسے درگزر کر دے گا اور اس کے ہاتھ قطع نہ کئے جائیں گے ورنہ ظاہر ہے کہ قطع ید کے بعد جب وہ چوری کرنے کا اہل ہی نہ رہے گا، تو یہ و اصلاح کا کوئی سوال ہی پید نہیں ہوتا۔

دوسرا ثبوت یہ ہے کہ قزاقی بغاوت اور لوٹ مار کی سزا قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا اُن کے

ؤں کاٹ ڈالے جائیں یا مقید کر دیا جائے (او ینفوا من الارض) اس لئے یہ بات کسی طرح قرین عقل نہیں ہو سکتی کہ ایسے
جرائم میں تو قید و بند کو بھی کافی سمجھا جائے اور معمولی چوری میں ہاتھ کاٹ ڈالنے کے علاوہ اس سے کم کوئی اور سزا پیش نظر
حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قزاقی و بغاوت کی انتہائی سزا قتل قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح چوری کی انتہائی سزا عادی مجرموں
ہاتھ کاٹ ڈالنا ظاہر کی گئی ہے۔ کم سے کم سزا کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ یہ بالکل حالات اور سرقہ کی نوعیت پر منحصر
ہو سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں صرف زبانی تنبیہ یا سزائے قید و بند کافی سمجھی جائے اور بعض حالات میں ہاتھ کاٹ ڈالنا
ب ہو اور اس کا فیصلہ قاضی یا حاکم کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ ایک بار رسول اللہ نے
وں کو جنھوں نے دوران سفر میں چوری کی تھی قطع ید کی سزا نہیں دی، حالانکہ اگر ہر چوری کی سزا مطلقاً قطع ید ہی ہوتی
ں اللہ کبھی درگزر نہ فرماتے۔ بعض احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ درختوں کا پھل چرانے اور امانت میں خیانت کرنے
رت میں آپ نے قطع ید کی ممانعت کر دی تھی۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک بار کسی نے دوسرے
ہوئے شخص کے سرہانے سے چادر چرالی اور چادر کا مالک اس کی قیمت لینے پر راضی ہو گیا تو آپ نے اس بات کو پسند کیا اور
کوئی سزا نہیں دی۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ قطع ید ایک انتہائی صورت سزا کی ہے جب کوئی شخص چوری کا عادی
ہو اور بار بار کی تنبیہ یا ہلکی تعزیر اس کی اصلاح نہ کر سکتی ہو۔

جو کچھ میں نے عرض کیا اس سے ظاہر ہے کہ تعزیرات کے باب میں اولین نظریہ عفو و درگزر ہے وہ کسی جرم کی عقوبت
اچھی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اسے بھی لفظ سیئۃ (برائی) ہی سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے سزا کے مختلف درجے قائم
ں جو جرم کی نوعیت اور اس کے نتائج کے لحاظ سے متعین کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اتلاف جان کی صورت میں بھی بجائے
ں کے خون بہا کی اجازت دیدی اور بعض صورتوں میں خون بہا کی رقم خود ادا کی۔

اب رہا مسئلہ زنا کے جرم میں سنگسار کر دینے کا، سو یوں تو بہت صاف ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں کسی جگہ زانی و زانیہ کو
سار کر دینے کا حکم نہیں بلکہ صرف سو کوڑے مارنے کی سزا تجویز کی ہے (فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ)
احادیث اور عمل صحابہ کے لحاظ سے ذرا الجھا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا قرآن میں صرف سو کوڑے مارنے کا حکم پایا جاتا ہے۔ لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ
ل اللہ اور بعض صحابہ نے سنگسار کرنے کا بھی حکم دیا اس لئے یہ سوال یقیناً پیدا ہوتا ہے کہ حکم قرآنی کے خلاف کیوں یہ
کیا گیا۔

اس باب میں ایک جماعت جو قرآن میں ناسخ و منسوخ کی قائل ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ پہلے کوڑے مارنے ہی کا
دیا گیا تھا اور بعد کو اسے منسوخ کر کے سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا، لیکن وہ رجم والی آیت کہاں گئی۔ اس کا کوئی جواب
کے پاس نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک قول تو حضرت عمر کا نقل کرتے ہیں کہ "رسول اللہ نے بھی رجم کیا اور
نے بھی اس پر عمل کیا ہے۔ لیکن ممکن ہے لوگ یہ کہیں کہ قرآن میں تو رجم کا حکم نہیں۔ اس لئے اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا
ہ پر کلام خدا میں زیادتی کا الزام لگایا جائے گا تو میں قرآن کے حاشیہ پر یہ حکم بھی درج کر دیتا کہ "الشیخ والشیخۃ
زنیا فارجموھما البتۃ" (بڑی عمر کے مرد و عورت اگر یہ حرکت کریں تو انھیں ضرور سنگسار کرو)

ایک روایت اور حضرت عائشہ سے بیان کی جاتی ہے کہ:-

رجم اور رضاعت کی آیتیں ایک کاغذ پر لکھی ہوئی میرے تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ جب رسول اللہ کا وصال ہوا ہملوگ تجہیز و تکفین میں مشغول ہوئے تو ایک بکری آئی اور اس کاغذ کو کھا گئی۔"

یہ روایت درایتاً قطعاً ساقط الاعتبار ہے۔ کیونکہ اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی تھی اور کیو تکیہ کے نیچے رہ گئی۔ علاوہ اس کے یہ بھی مستبعد ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی ہو اور فوراً ضبط تحریر میں نہ لائی گئی ہو۔ جیسا کہ معم و دستور تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آیت ٹھیک اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ کا وقت رحلت قریب تھا تو بھی اس روایت سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ نزول آیت اور رحلت نبوی کے درمیان اتنا وقفہ ضرور رہا تھا کہ کاتب وحی نے اس کتابت کر کے حضرت عائشہ کو دیدی ہوگی اور دوسرے صحابہ نے بھی جو رحلت نبوی کے وقت موجود تھے اس کو سنا ہوگا۔ لیکن اس کی تصدیق کسی دوسرے صحابی کے بیان سے نہیں ہوتی اور یقیناً اس کو حضرت عائشہ سے غلط منسوب کیا گیا ہے

اب رہا حضرت عمر کا قول سو اس سے خود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کو رجم والی آیت کا پورا یقین نہ تھا۔ تاہم بات ضرور آپ کے کان میں پڑ چکی تھی۔ سو اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حسب بیان زید بن ثابت رسول اللہ ایک بار یہ فرمایا تھا کہ " اذا زنا الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ " لیکن یہ رسول اللہ کی ذاتی رائے تھی حکم خداوند نہ تھا اور اسی لئے زید بن ثابت نے اسے بزمرۂ وحی قلمبند نہیں کیا۔ جب بعد میں حضرت عمر نے اس کو سنا تو وحی الٰہی خیا کیا اور اسی بنا پر متن قرآنی میں نہ پائے جانے پر آپ کو تعجب ہوا۔

سب سے بڑا ثبوت رجم کے حکم خداوندی نہ ہونے کا ہم کو خود قرآن ہی سے ملتا ہے۔ سورۂ نساء میں جہاں لونڈیوں نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہیں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ

" فاذا احصن فان اتین بفاحشۃ فعلیھن نصف ما علی المحصنات من العذاب "

(اگر شادی شدہ لونڈیوں سے فحش سرزد ہو تو آزاد منکوحہ عورتوں کے مقابلے میں نصف سزا دی جائے) اس ظاہر ہے کہ خدا نے زنا کی سزا رجم مقرر نہ کی تھی ورنہ نصف سزا کا ذکر سورۂ نساء میں نہ ہوتا۔ کیونکہ سنگساری کے معنی یقینی موت کے ہیں۔ اور موت کی سزا کو نصف نہیں کیا جا سکتا۔

سورۂ نور اور سورۂ نساء دونوں مدنی سورتیں ہیں جو ہجرت کے چوتھے سال نازل ہوئیں۔ اس سے قبل کوئی حک حد زنا کے باب میں نازل نہ ہوا تھا اور رسول اللہ نے شریعت یہودی کے مطابق رجم کی سزا تجویز کی تھی۔ لیکن جب سورۂ نور کے نزول کے بعد حد زنا کوڑے مارنا مقرر کی گئی تو پھر رجم کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور غور طلب ہے وہ یہ کہ سورۂ نور کی آیت میں زانی و زانیہ سے کیا مراد ہے۔ ک جاتا ہے کہ اس سے مراد صرف غیر شادی شدہ مرد عورت مراد ہیں لیکن اگر وہ شادی شدہ (یعنی محصن و محصنات) ہوں تو ان کی سزا رجم ہی ہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ صراحت کسی جگہ قرآن میں نہیں پائی جاتی۔ اگر کوڑے لگا کا حکم صرف کنواروں ہی کے لئے تھا تو لازماً شادی شدہ زانیوں کی سزا بھی متعین کرنا چاہیے تھی حالانکہ اس کا ذکر کہیں موجو نہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس ذکر کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ جب سورۂ نساء میں صراحتاً یہ کہہ دیا گیا تھا کہ شادی شد لونڈیوں کی حد زنا آزاد منکوحہ عورتوں کے مقابلے میں نصف ہے تو اس سے ثابت ہو گیا کہ محصن و محصنات کی سزا بھی کوڑ ہی مارنا تھی۔

امید ہے کہ اس تفصیل کے بعد کسی کا یہ خیال کرنا کہ حدود شرعی کا قیام وحشیانہ بات ہو گی اور عہد حاضر میں اس پر عمل دشوار ہو گا، مناسب نہ ہو گا۔

قصاص نفس کی صورت میں ایک بات کا ذکر رہ گیا تھا وہ یہ کہ اسلام نے قتل مرتد کا بھی حکم دیا ہے۔ لیکن یاد رکھئے یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے۔ کیونکہ عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ محض ارتداد کی بنا پر کسی کو قتل کیا گیا ہو بلکہ اصلی سبب قتل کا وہ سازشیں تھیں جو اسلام میں تفرقہ ڈالنے اور ملک میں فساد پیدا کرنے کے لئے مرتدین کی طرف سے ظاہر ہوتی تھیں۔ یہ بحث کافی طویل ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو اس پر بھی کسی وقت اظہار خیال کروں گا۔

---

(۲)

دالشلیم کے نام ایک خط

نگار میں "دالشلیم" کا ایک مضمون "ارکان حج" کے موضوع پر شائع ہوا تھا جو نتیجہ تھا خود ان کے ذاتی تجربات و تاثرات کا۔ اسے عام طور پر بہت پسند کیا گیا۔

اسی سلسلے کی چیز ذیل کی ایک تحریر بھی ہے جو دالشلیم کے ایک دوست نے بغداد سے انھیں بھیجی ہے۔ ہر چند اس کی اشاعت نگار میں ضروری نہ تھی۔ لیکن چونکہ بعض فقرے اس میں ایسے بھی ہیں جن کا تعلق نگار سے ہے۔ اس لئے اس کی اشاعت چنداں بے محل بھی نہیں۔ نیاز

بغداد ۷ رجنوری سنہ ۶۵ء

برادرم ــــــ "

تمھاری خفگی بجا ہے۔ مقالہ اور نگار کا اکتوبر نمبر میرے پاس بہت دنوں رہ گئے۔ تمھارے مقالے کے مختصر اور مکمل دونوں رُخ دیکھے۔ تم نے کمال کیا ہے کہ ایسے خشک اور تیلے موضوع پر اتنا تر و تازہ سبک رو مضمون لکھ دیا۔ میری رائے میں اب اس مضمون کو خانگی طور پر شائع کر کے عام مسلمانوں میں تقسیم کرا دو۔ قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز!

تم نے "نگار" کا سہارا لے کر اور گمنامی کی آڑ میں بہت ساری کھری کھری باتیں سُنائی ہیں مگر اس حق گوئی اور بیباکی کا کیا نتیجہ ہو گا؟ "چوں حرف حق بلند شود دار میشود!"

"نگار" کے اس نمبر میں حسین رض اور یزید پر ایک تازہ بحث کا سلسلہ چلا ہے مگر اس قسم کی بحثیں زیادہ تر محض اکیڈمک ہوتی ہیں کیونکہ یزید کے پیر داپنی روش کو نہیں چھوڑیں گے اور نہ محبان اہل بیت حسین کے دامن کو اپنے ہاتھوں سے جانے دیں گے۔ کسی فارسی لغت میں ناخلف

کے معنی "سید سنی" لکھے ہیں۔ ان حضرات کی رائے میں حسین بھی قابل احترام ہیں اور یزید

بھی۔ اس طرح معاویہ بھی صحابیٔ رسول ہیں اور یزید بھی۔

مے بھی ہوٹل میں پیو، چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں، شیطان بھی بیزار نہ ہو

(**نگار**) یہ بات بالکل صحیح ہے کہ حسین و یزید کی بحث بالکل اکیڈمک ہے، اور ایک یہ کیا رحلت نبوی کے بعد جو اختلافات رونما ہوئے اب وہ سب اکیڈمک حیثیت رکھتے ہیں اور نگار نے ہمیشہ اسی حیثیت سے ان پر گفتگو کی ہے۔

میرا مقصود نہ کسی شیعی کو سنی بنانا ہے اور نہ کسی سنی کو شیعہ، کیونکہ اول تو سرے سے یہ کوشش ہی بے معنی سی بات ہے، دوسرے یہ کہ دنیا نام ہے صرف "تو تو میں میں" کا اور اسے باقی رہنا چاہئے اگر ہم دنیا کی رونق قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ "یزید و حسین" کی بحث کا خوشگوار پہلو بھی یہی "تو تو میں میں" ہے۔ خلف و ناخلف اگر ایک ہو جائیں تو داستان سلف بے آب و رنگ ہو جائے۔ اور درایتی شعور ہمیشہ کے لئے ختم ــــ رہا مذہب سو اس کا دخل در معقولات سے علیحدہ رہنا ہی مناسب ہے۔ کیونکہ اگر وہ عوّامی کا خیال چھوڑ دے گا تو بھی "قامت و دست" کے نظارہ کی توفیق اسے کہاں ؟ اللہ بس باقی ہوس۔

اس قسم کے مباحث سے میری رائے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو تاریخ کی چھان بین کا موقع مل جاتا ہے اور کبھی کبھی اس سلسلے میں کوئی بات ایسی بھی نکل آتی ہے جو پہلے اوجھل تھی۔

وہ حضرات جو اس قسم کے مباحث کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ان سے میرا خطاب نہیں بلکہ ان حضرات سے جو روایات سے ہٹ کر محض عقل و درایت سے کام لے کر تاریخ کا مطالعہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ کہ ایسے حضرات بہت کم ہیں۔ اور مذہب سے خالی الذہن ہو کر غور کرنے والا تو شاید ایک بھی نہیں۔

ماجدولین نمبر نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

فرانسیسی ادب لطیف کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دلدوز تاریخی رومان جس کی نظیر کسی زبان کے ادب میں نظر نہ آئے گی!

- ★ اُسے پہاڑوں نے سُنا اور کانپ اُٹھے۔
- ★ زمین نے سُنا اور تھرّا اُٹھی۔
- ★ خدا نے سُنا اور تا دیر ملول رہا۔
- ★ جسے روح سُنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کر نئی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے۔

قیمت : ۔ ۳ روپے

نگار پاکستان ۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

باب الاستفسار

(۱)

امیر خسرو اور ہندی اردو الفاظ

مس الدین صاحب - لائلپور)

حضرت امیر خسرو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہندی بھاشا کے بھی ماہر تھے اور اردو کے بھی جس کے ثبوت میں ان کے دوہروں، پہیلیوں، کہہ مکرنیوں وغیرہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال صحیح نہیں اور جو چیزیں ان سے منسوب کی جاتی ہیں، غلط ہیں۔

ر) ہو سکتا ہے کہ ہندی بھاشا وغیرہ کا جو کلام ان سے منسوب کیا جاتا ہے اس کا اکثر حصہ الحاقی ہو۔ لیکن یہ خیال کہ وہ ہندی
شا سے واقف نہ تھے اور اردو کے بعض وہ الفاظ جو اس وقت بھی رائج ہیں، انھوں نے استعمال نہیں کئے یقیناً صحیح نہیں۔
یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ امیر خسرو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں کے ہندو مسلم مشترک کلچر میں ان کا نشوونما
اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندی بھاشا سے نابلد رہے ہوں جس کی شاعری کا اس وقت عروج تھا۔ یا وہ نئے الفاظ
کی فارسی اور ہندی بھاشا کے میل سے رواج پا گئے تھے، امیر خسرو کے علم میں نہ ہوں۔

خسرو غیر معمولی ذہانت کے بڑے وسیع المشرب انسان تھے۔ وہ ہندوستان کی ہر ہر چیز اور یہاں کی زندگی کے تمام
فل سے حد درجہ دلچسپی لیتے تھے۔ اسلئے یہ امر مستبعد نہیں کہ انھوں نے یہاں کی زبان پر بھی عبور حاصل کر لیا ہو اور اس
ت کی پراکرت میں جو نئے نئے الفاظ شامل ہوتے جا رہے تھے وہ انھوں نے استعمال نہ کئے ہوں۔ وہ ہندوستان
ذیب اور یہاں کے قدیم روابط حیات سے اس درجہ مانوس ہو گئے تھے کہ وہ ہندوؤں کے ان تہواروں کا بھی پورا
ں اٹھاتے تھے جو شریعت کے ظاہری نقطۂ نظر سے داخل سیئات ہیں۔ چنانچہ اعجاز خسروی کے تتمہ میں جو انشاء خسروی
ام سے منسوب ہے۔ آپ کو متعدد خطوط ایسے ملیں گے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے قدیم کلچر سے کس درجہ
س ہو گئے تھے مثلاً اسی ایک خط کو لے لیجئے جو "مکتوب بہار و خزاں در فراق جاناں" کے عنوان سے انھوں نے
ہے اور اس میں انھوں نے ہولی کا ایک منظر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

خوباں مستاں و غلطاں گشتہ گاہے راست و گاہے کج شدہ مُرمُر مبہ جھر بٹ می رقصیدند
و بزبان بیزبانی حسب حال خود دھمال می خواندند:-

گھر آیو رنگیلی بامہ مرمر جھرمٹ کھیلئے
نیک دلی دے پیا گل باتھ مرمر جھرمٹ کھیلئے

مانم بقلم نقاش تقدیر کہ گلرخاں ہند را بے نظیر تصور کردہ کہ در تحریر نمی گنجد ــــ"

اس کے بعد وہ ان گلرخان ہند کو جوہی، چنبیلی، نواڑی، چمپا وغیرہ کے ہاروں سے آراستہ دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ

" پیش بتاں طناز چوں دہماری خوانند و بہ ایں راگ بیراگ بہاگ می رقصند ۔

آیو پریتم تم بن بھاگ کھیلی ایسی
تن ہولی چھڑکیں عبیر اسوں کی پچکاری جیسی

نایکہ بھید کے موضوع پر ایک رقعہ میں یہ فقرہ لکھتے ہیں کہ ۔

" درنظر ایں یک بیں نازنین و ناری یکے ست "

اسی طرح موسم برشکال کے ذکر میں ایک جگہ یہ جملے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں ۔

" اشک خونیں قطرہ قطرہ جاری ، گو یا بیر بہوٹی ست بہاری "

یا " سرانگشتان حنابستہ بیر بہوٹی گشتہ "

ان اقتباسات بالا میں ملاحظہ کیجئے کہ انھوں نے کتنے الفاظ پراکرت کے استعمال کئے ہیں جن میں سے بعض اب بھی اسی طرح یا بادنیٰ تغیر مستعمل ہیں مثلاً ۔

مرمر کہ یہ دراصل مرمر ہے ۔ جھرمٹ ۔ جوہی ۔ چنبیلی ۔ نواڑی ۔ چمپا ۔ آیو (بہ معنی آؤ) پھاگ کھیلنا ۔ پچکاری ۔ بیر بہوٹی ۔ دھمار ، بیراگ ۔ بہاگ ۔ ناری وغیرہ کہ ان تمام الفاظ سے ہم بھی پوری طرح مانوس ہیں ۔

الغرض اس میں شک نہیں کہ امیر خسرو کے زمانے میں ریختہ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس حقیقت کے پیش نظر اگر تمام پہیلیوں ، کہ مکرنیوں وغیرہ کو ان سے منسوب کیا جائے تو یہ بات غلط نہ ہوگی ، گو اس بات کا امکان ضرور ہے کہ ان میں بعض یا اکثر الحاقی ہوں اور ان سے غلط منسوب کردی گئی ہوں ۔

---

(۲)

بخاری و مسلم

حمیدہ خاتون عباسی ۔ کمرشل ایریا ۔ سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

۱ آپ کا ماہ نامہ "نگار" ہر ماہ نظر سے گزرتا ہے اور یہی ایک رسالہ ایسا ہے جو تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے ۔ آپ سے گذارش ہے کہ مسلم و بخاری جو دو راوی ہیں اُن کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کریں ۔ نوازش ہوگی ۔

(نگار) (۱) امام بخاری اور مسلم راوی نہیں تھے بلکہ محدث تھے ۔ یعنی انھوں نے احادیث کی صرف روایت نہیں

روایات کو جو رسول اللہ سے منسوب تھیں ایک جگہ بڑی کوشش و محنت سے جمع کیا۔

حدیث کی چھ کتابیں بہت صحیح تسلیم کی جاتی ہیں جنھیں "صحاح ستہ" کہتے ہیں انھیں میں ایک مجموعۂ احادیث امام بخاری الصحیح" کہلاتا ہے اور مسلم کا "صحیح مسلم"

بخاری کا پورا نام "محمد بن اسمٰعیل ابو عبداللہ الجعفی" تھا۔ سنہ ۱۹۴ھ میں شہر بخارا میں پیدا ہوئے۔ بہت کمسنی میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور اس فن کے حاصل کرنے کے لئے انھوں نے انتہائی کوشش سے کام لیا۔ ان کی عمر صرف سولہ سال و مدینہ کے مشہور ائمۂ حدیث کے درس میں شریک ہو گئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ مصر گئے اور احادیث کی جستجو میں ی سیاحت کی۔

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لاکھوں احادیث میں سے صرف انھیں حدیثوں کو اپنے مجموعہ میں شامل کیا جنھیں وہ قابل اعتبار ، چنانچہ انھوں نے ایک کتاب تاریخ الکبیر کے نام سے بھی تصنیف کی جس میں انھوں نے راویوں کے حالات اور ان کے نہ ہونے پر بھی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اور بھی متعدد کتابیں لکھیں جن میں ایک قرآن پاک کی تفسیر بھی ہے۔ ان کا انتقال ی میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۶۲ سال کی تھی۔

(۲) مسلم کا پورا نام "مسلم بن الحجاج ابو الحسین قشیری" تھا۔ سنہ ۲۰۲ یا سنہ ۲۰۶ ہجری میں بمقام نیشاپور پیدا ہوئے ی کے ہمعصر تھے اور انھوں نے بھی جمع احادیث کے لئے عرب، مصر، شام، عراق کا سفر کیا اور بڑے بڑے اکابر فن سے حاصل کیں۔

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۳۰۰ لاکھ روایات فراہم کیں لیکن اکثر اس خیال سے رد کر دیں کہ وہ ان کی رائے میں قابل اعتماد ور صرف ان کا انتخاب شائع کیا جو صحیح مسلم کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے فقہ اور تذکرہ محدثین پر بھی متعدد کتابیں ن اب وہ ناپید ہیں۔ ان کا انتقال سنہ ۲۶۱ ہجری میں ہوا یعنی بخاری کی وفات کے پانچ سال بعد۔

ان کے مختصر حالات تو میں نے عرض کر دیئے۔ لیکن یہ بات کہ ان دونوں حضرات کے مجموعہ ہائے احادیث کس حد تک ں ، بالکل دوسرا مسئلہ ہے۔ تاہم مختصراً عرض کرتا ہوں کہ جن احادیث کا تعلق عبادات و معاملات و اخلاقیات سے ہے ت یا عدم صحت پر تو گفتگو کرنے کی کوئی وجہ نہیں، لیکن جو روایات تاریخ و تفسیر یا پیش گوئیوں سے تعلق رکھتی ہیں ان پر ہو سکتی ہے اور سچ پوچھئے تو ازروئے درایت ان میں سے اکثر قابل قبول نہیں۔

---

(۳)

غالب کے ایک شعر کا عروضی وزن

(... حسین صاحب - کالپی)

غالب کا ایک مشہور شعر ہے ؎

کہتے ہو نہ دینگے دل ہم اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

پہلے مصرع میں " کہتے ہو " کو میں کھینچکر پڑھتا ہوں یعنی کہتے کی تی کو زیادہ نمایاں کرکے پڑھنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس طرح مصرع میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے ۔ لیکن ایک صاحب اس کو صحیح نہیں سمجھتے ۔ یہی صورت " دیں گے " کی تی کی ہے ۔ آپ کی کیا رائے ہے ۔

(نگار) غالب کا یہ شعر " بحر ہزج مثمن اشتر " کا ہے جس کا وزن ہے " فاعلن ۔ مفاعیلن ۔ فاعلن ۔ مفاعیلن " ہے تقطیع یوں ہوگی ۔ کہتے ہو (فاعلن) ۔ نہ دینگے دل (مفاعیلن) ۔ ہم اگر (فاعلن) ۔ پڑا پایا (مفاعیلن) ۔ اس لئے اگر آپ نے کہتے کو کھینچ کر پڑھا تو پہلے رکن کا وزن مفعولن ہو جائے گا ۔ جو نا درست ہے ۔ اب رہ گیا دی کی ی سو اس کو یقیناً کھینچکر پڑھنا ہوگا ورنہ بصورت دیگر " نہ دیں گے دل " کا وزن مفاعیلن کے بجائے مفاعلن ہو جا اس میں شک نہیں " نہ دینگے " کو کھینچ کر پڑھنا اچھا معلوم ہوتا ہے اور مفہوم میں زور بھی پیدا ہو جاتا لیکن وزن شعری اس کی اجازت نہیں دیتا ۔

---

(۴۱)

زیب النساء اور عاقل خاں

(بجواب استفسار سید محمد حسین ، شیر شاہ کالونی کراچی)

بعض باتیں اس قدر غلط مشہور ہو جاتی ہیں کہ اگر ان کی تصحیح کی جائے تو بھی اس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو تامل ہوتا ہے اور اسے محض جانبداری تصور کرتے ہیں ۔ منجملہ انھیں باتوں کے ایک روایت زیب النسا اور عاقل خاں کی باہمی محبت اور عا کے دردناک انجام کی ہے جس کا ملزم اورنگ زیب کو قرار دیا جاتا ہے ، حالانکہ حقیقت سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

ہندوستان کے انگریزی داں طبقہ میں اس کا آغاز " مسز ولیٹ برورک " کے مرتب کئے ہوئے اس دیوان مخفی (زیب ا کے دیباچے سے ہوتا ہے جس میں اس نے زیب النساء اور عاقل خاں کے رومان کو بڑے مزے لے لے کر پیش کیا ہے ۔ اس خاتون کا ماخذ کیا تھا ۔ لاہور سے شائع ہونے والی ایک کتاب " درمکتوم " منشی احمد الدین کی لکھی ہوئی ۔ لیکن خود منشی صا کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں ۔ اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے ۔ خود انھوں نے تو اس کا ذکر کہیں کیا نہیں ۔۔!

اور جس وقت ہم عہد عالمگیر اور اس کے بعد کی کتب تواریخ کو سامنے رکھتے ہیں تو بھی وہ یکسر اس ذکر سے خالی نظر آتی ہیں ۔ نہ خافی خاں کی تاریخ میں اس کا پتہ چلتا ہے (جو عالمگیر کے ایک ربع صدی بعد مرتب کی گئی) اور نہ ماثر الامراء میں جو سے بھی بعد کا تذکرہ ہے ۔ اسی طرح غیر مسلم مورخین کی کتابیں بھی اس ذکر سے خالی ہیں ۔

برنیر اور منوچی تو غیر ملکی ہی مورخ تھے اور ایسے متعصب کہ انھوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام وہی واقعات درج ہیں جن سے دربار مغلیہ کی توہین ہو سکتی ہے ۔ لیکن اس واقعہ کا ذکر انھوں نے بھی نہیں کیا ۔ یہاں تک کہ بھیم سین اور ایشر ہندو مورخین کی کتابیں بھی اس ذکر سے خالی ہیں ۔

اب آئیے اس مسئلہ پر تاریخ و روایت دونوں کو سامنے رکھ کر غور کریں ۔ اس سلسلے میں چند باتیں خصوصیت کے ساتھ
...ب ہیں ، ایک یہ کہ عاقل خاں کون تھا ۔ دوسرے یہ کہ زیب النساء کا اٹھان کس طرح ہوا تھا ۔ تیسرے یہ کہ ... زمانہ کا یہ
...یان کیا جاتا ہے وہ حالات سے منطبق ہوتا ہے یا نہیں ۔

عاقل خاں (میر عسکری نام) عہد شاہجہاں کا امیر تھا اور جب اورنگ زیب دکن کی گورنری پر مامور ہوا تو اس کو جلوداری کی حیثیت
...ر کر دیا گیا ۔ جب اورنگ زیب نے حصول سلطنت کے لئے دکن سے دہلی کا رخ کیا تو عاقل خاں کو قلعۂ دولت آباد کی حفاظت
...ر چھوڑ گیا کیونکہ خواتین کو اورنگ زیب اپنے ساتھ دہلی لے گیا تھا ۔ یہ واقعہ ۱۶۵۸ء کا ہے جبکہ زیب النساء کی عمر بیس سال کی
...ر وہیں قلعہ دولت آباد میں مقیم تھی ۔ یہ عمر زیب النساء کے عنفوان شباب کی تھی اور عاقل خاں کی عمر بھی ۳۶ یا ۳۷ سال کی
...لیکن ان دونوں کی محبت کا تعلق اس زمانے سے ظاہر نہیں کیا جاتا بلکہ اس زمانہ سے جب عاقل خاں ۱۶۶۰ء کے اختتام پر
...ئے علالت دوآبہ کی فوجداری سے دست کش ہو کر لاہور میں مقیم ہو گیا تھا اور پھر جب ۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب مع خواتین
...یر سے مراجعت کر کے لاہور آیا تو عاقل خاں کو اس نے چند روز کے لئے داروغۂ غسل خانہ مقرر کر دیا ۔ اور اگر یہ واقعہ
...ت کا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دیگ میں دم پخت ہونے کا زمانہ ۱۶۶۳ء ہی رہا ہوگا ۔ حالانکہ تاریخ سے ثابت
...ہے کہ داروغۂ غسل خانہ کی چند روزہ خدمت کے کئی سال بعد ۱۶۶۹ء میں داروغۂ ڈاک چوکی (فیمی پوسٹ ماسٹر جنرل) کی خدمت
...ے سپرد ہوئی ، پھر ۱۶۸۰ء میں وہ دہلی کا صوبہ دار بنا دیا گیا اور مرتے دم یعنی ۱۶۹۶ء تک اسی خدمت پر مامور رہا ۔

اگر کہا جائے کہ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب وہ دہلی کا صوبہ دار تھا تو بھی اسے عقل قبول نہیں کرتی کیونکہ یہ زمانہ وہ تھا
...عاقل خاں کی عمر ۵۰ سے متجاوز ہو چکی تھی اور زیب النساء کی بھی جوانی ڈھل چکی تھی ۔ اس عمر میں عشق و محبت کا یہ شدید جذبہ
...ب النساء اس سے چھپ چھپ کر ملے اور عاقل خاں دیگ کے اندر جل کر جان دیدے ۔ کیونکہ پیدا ہو سکتا تھا ۔ یہ زمانہ اگر ہو سکتا
...صرف دولت آباد ہی کے دوران قیام کا کہ دونوں جوان تھے نہ کہ دہلی کا جب دونوں کی جوانی ختم ہو چکی تھی ۔

اس سلسلے میں ایک بات اور عجیب و غریب کہی جاتی ہے کہ جب ۱۶۶۹ء میں عاقل خاں نے پوسٹ ماسٹر جنرل کی خدمت سے
...ا دیا تو وہ سات سال تک گمنامی کی حالت میں رہا کیونکہ وہ اورنگ زیب کا معتوب ہو گیا تھا اور اس کے ثبوت میں شاہزادہ اکبر
...تحریر پیش کی جاتی ہے جس میں اس نے اپنی بہن زیب النساء کو لکھا تھا کہ " چونکہ بادشاہ نے حکم دے دیا ہے کہ کوئی تحریر جس پر
...ل خاں کی مہر ہو اندر نہ جانے پائے اس لئے اب میں زیادہ احتیاط سے کام لوں گا "
حالانکہ اکبر بادشاہ نے جس عاقل خاں کا ذکر کیا ہے وہ بالکل دوسرا شخص تھا جسے ملا محمد عاقل کہا کرتے تھے یہ اپنے عہد کا
...ر فقیہ تھا اور زیب النساء کو اجازت تھی کہ وہ اس سے خط و کتابت کرے لیکن جب اورنگ زیب کو معلوم ہوا کہ ملا عاقل بھی اکبر شاہ
...فدار ہے تو اورنگ زیب نے اس کے خطوط کو بھی اندر جانے سے روک دیا جس کا ذکر اکبر شاہ نے اپنے خط میں کیا ہے ۔ اسی کے ساتھ چونکہ
...ب النساء بھی اپنے حقیقی بھائی شاہزادہ اکبر کی حامی تھی (جس نے عالمگیر کے خلاف راجپوتانہ میں علم بغاوت بلند کیا تھا ۔) اس لئے
...گ زیب نے اپنی بیٹی (زیب النساء) کی بھی پنشن چار لاکھ سالانہ کی ضبط کر لی اور قلعہ سلیم گڈھ میں اسے قید کر دیا ۔ گو بعد میں
...س کا قصور معاف کر دیا گیا اور وہ آزاد ہو گئی ۔

اس کے ساتھ جب ہم زیب النساء کی تعلیم و تربیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس سے بھی عاقل خاں کے ساتھ اس کی خفیہ محبت
...دید ہوتی ہے کیونکہ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد اس میں موزوں شاعرانہ ذوق بھی پیدا ہو گیا تھا ۔ اور جب کبھی اس کی شادی کا سوال

سامنے آیا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کے ذوق تصوف کا ثبوت اس کے کلام سے بھی [illegible] ہے۔ مثلاً۔

نو رم تارم حدیقہ ام من گلزارم — دیرم صنم برہمنم من زنارم
نے نے غلطم دریں میاں ہیچ نیم — بوئے گلم وطبیعت بیمارم

از تاب وتبسم مہر سمارا کہ خبر کرد — دز گریۂ من ابر وہوارا کہ خبر کرد
بیرون ہمہ سرسبز ودر دنش ہمہ خوں — از فطرت من برگ خارا کہ خبر کرد

پروانہ نیستم کہ بیک دم عدم شوم — شمعم کہ جاں گدازم ودودے نیادرم
نہال سرکش وگل بے وفاولالہ دورنگ — دریں چمن بہ چہ امید آشیاں بندم

از ما بپوش چہرہ کہ ماب ادب نیم — کوتہ ترست از مژہ ما نگاہ ما

باز امشب نالۂ زارم پریشاں می رود — سیل اشکم دست در آغوش طوفاں می رود

زیب النساء بڑے پاکیزہ خصائل کی مالک تھی اور احکام شریعت کی سخت پابند اس کو مذہب سے خاص لگاؤ تھا اور مطالعہ اس کا محبوب مشغلہ، یہاں تک کہ اس نے ایک تفسیر قرآن بھی لکھی جس کا نام زیب التفاسیر ہے۔

ناصر علی وغیرہ شعرا وقت سے جس نوک جھونک کا ذکر بعض غیر معتبر کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یکسر مزخرفات ہیں

نظیر نمبر

جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعرا کا فرق، معاصرین کی رائیں۔ مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسکی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت: تین ۳ روپے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی نمبر ۳

(اس۔ام۔ ولی کراچی)

بہت قریب ہم ان کے پہنچ چکے ہیں ولیؔ
بس اک حجاب سا باقی ہے درمیاں "اپنا"

منزل یقین پہ پہنچا مرا خیال
ہیں اپنے ہی وجود کا قائل نہیں رہا

بعنوان عشق و غم و درد و فرقت
مری زندگی کے فسانے بہت ہیں

ترے عاشق ہی رسوائے جہاں ہیں
الٰہی کیا تماشا ہو رہا ہے

مل سکے لذت سکوں کیونکر
بیقراری اگر پسند نہیں

وہ یاد ماضی ہے یا ہے امید مستقبل
حیات اس کے سوا اے ولیؔ بتا کیا ہے

ایسا نہ ہو کہیں کہ تجھے بھول جاؤں میں
ہوتی رہیں جفائیں بھی لطف و کرم کے ساتھ

بات یہ ہے کہ تم ہو مجھ کو پسند
اور تو کوئی خاص بات نہیں

شکوہ زباں سے گو کبھی کرتا نہیں ہوں میں
تو ہی بتا کہ کیا ترا بندہ نہیں ہوں میں

اسی لئے تو ہیں دنیا سے دور، دنیا میں
بہت قریب سے دنیا کو ہم نے دیکھا ہے

کبھی ایسے بھی آجاتے ہیں لمحے زندگانی میں
نہ آنا موت کا ناقابل برداشت ہوتا ہے

ہمیں اُنس ہے ان سے اپنی ہی خاطر
ہم اپنے کو ان سے سوا چاہتے ہیں

(اثر لکھنوی)

دل کی عدو ہوئی ہے باندازِ آشنا
تجھ سے حذر رہے اے نگہ نازِ آشنا

ہمت کہ دور منزل مقصود اب نہیں
آنے لگی ہے کانوں میں آوازِ آشنا

بیدلؔ کی طرح مجھ سے بھی پنہاں رہا اثرؔ
"انجام کار دشمن و آغاز آشنا"

دل عشق کی مے سے چھلک رہا ہے
اک پھول ہے جو مہک رہا ہے

آنکھیں کب کی برس چکی ہیں
کوندا اب تک لپک رہا ہے

اب آئے بہار یا نہ آئے — آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

ہے دور بہت زمانِ وعدہ — اور دل ابھی سے دھڑک رہا ہے

کس نے وحشی اثر کو چھیڑا — دیوار سے سر پٹک رہا ہے

ہشیار کو اک آن میں دیوانہ بنا دے — دیوانہ جسے نرگس مستانہ بنا دے

بدمست کو ہشیار کہ ہشیار کو بدمست — جو چاہے جسے گردشِ پیمانہ بنا دے

سن اے دلِ ناشاد وہ کیا پوچھ رہے ہیں — حسرت کی نگاہوں کو اب افسانہ بنا دے

دامن نہ ہو آلودہ اثر گردِ دوئی سے — مقصود کو مطلوب سے بیگانہ بنا دے

کوئی روٹھا ہوا پھر مہرباں ہے — مرے حسرت بھرے دل تو کہاں ہے

خدارا ہمّت اے پائے شکستہ — نظر کے سامنے وہ آستاں ہے

نشیمن سے جو اُٹھا تھا اسیرو — مری آنکھوں میں اب تک وہ دھواں ہے

قفس میں ہو گیا اکثر یہ دھوکا — ستارا صبح کا یا آشیاں ہے

نگاہیں مل کے جھکنا ، دل کا جانا — مری آنکھوں میں اب تک وہ سماں ہے

مژہ گندیدہ ، چہرہ زرد ، لب خشک — اثر پندارِ خودداری کہاں ہے

(...شاہ جہاں پوری)

...آنکھوں میں کٹ جاتی ہے دل پر وہ مصیبت ہوتی ہے — میں تارے گنتا رہتا ہوں جب دنیا غافل ہوتی ہے

...ستم پرور تیری ہر چھیڑ دیا منت ہوتی ہے — جس راہ میں سر دھنتا ہے کوئی اس راہ میں کانٹے بوتی ہے

...کی چمن آرائی کا گویا ایک اثر ہے دونوں پر — غنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں شبنم ہے کہ پیہم روتی ہے

...کے مقدر میں ساحل کیا خوف انھیں طغیانی کا — جو ڈوب رہا ہو اس کو تو ہر موج قیامت ہوتی ہے

گو پیش نظر کوئی بھی نہ تھا گھبرا کے جدھر دیکھا یہ سنا
کیا میرے تغافل کا شکوہ تقدیر ہی تیری سوتی ہے

ناوک نہیں کہ پیکاں ناوک کا اے عشق اسے میں کیا سمجھوں
ایک ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے رہ رہ کے کھٹک سی ہوتی ہے

ہیں اشک رواں اور اشکوں میں شامل ہے عرق پیشانی کا
محشر میں ندامت قاتل کی دامن کا لہو اب دھوتی ہے

کشتی ہے مری محفوظ فنا اس کی ہے بقا گہرائی میں
جس نے بھی کیا رخ ساحل کا وہ نذر تلاطم ہوتی ہے

ہنگام غم حسنین اے دل ہر اشک کا یہ حاصل سمجھو
رہ جائے تو نوک نشتر ہے بہ جائے تو سچا موتی ہے

مولانا نیاز فتحپوری کی پانچ کتابیں

من ویزداں
مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اور اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ قیمت:- ۷ روپے ۵۰ پیسے

شہوانیات
اس میں تاریخی علمی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کے میلان شہوانی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت:- ۴ روپے ۵۰ پیسے

فراست الید
اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی ساخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، عروج و زوال، موت و حیات وغیرہ پر پیشن گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت:- ایک روپیہ

شہاب کی سرگذشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ قیمت:- ۲ روپے

امیر معاویہ ویزید
مولانا محمود عباسی کی کتاب "خلافت امیر معاویہ ویزید" پر مولانا نیاز فتحپوری کا عالمانہ و بے لاگ تبصرہ۔ قیمت:- ۵۰ پیسے

(جون ۶۵ء میں شائع ہو رہی ہیں)

نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی نمبر ۳

مدنی اصلی بہشتی زیور مکمل

حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف بہشتی زیور

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ ۱۔ دین کیا ہے ۲۔ دُنیا میں کس طرح رہنا چاہیئے ۳۔ ماں باپ کے حقوق کیا ہیں ۴۔ بیوی کے حقوق کیا ہیں ۵۔ بچّوں کی تربیت کس طرح ہونی چاہیئے ۶۔ شوہر کے حقوق کیا ہیں۔ ۷۔ اولاد کے حقُوق کیا ہیں ۸۔ بیاہ شادی پر اسلام کن رسُومات کی اجازت دیتا ہے ۹۔ دُنیاوی بیماریوں کا آپ خُود کس طرح علاج کر سکتے ہیں ۱۰۔ اسلامی آداب و اخلاق کیا ہیں تو مدنی بہشتی زیور کا مُطالعہ کیجئے جس میں ایسی سیکڑوں باتیں زندگی میں قدم قدم پر آپ کی رہنمائی کریں گی۔ یہ ایسی کتاب ہے جو باپ، بیٹوں، بھائی، بہنوں، بیویوں، شوہروں، اولاد اور والدین سب کے لئے یکساں مُفید ہے۔

ہم نے درج ذیل خوبیوں کے ساتھ شائع کی ہے :- (۱) کتابت انتہائی خوشخط (۲) آفسٹ کی رُوح پرور دیدہ زیب طباعت (۳) ہر صفحے پر خوشنما باڈر (۴) سرورق دو رنگہ دیدہ زیب آرٹ پیپر (۵) جلد مضبُوط بائنڈنگ کلاتھ (۶) سائز ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۸۰۴ صفحات ::

ایسی کتنی ہی گوناگوں خُوبیوں کے باوجود ہدیہ انتہائی رعایتی و مُناسب مجلّد چھ روپے پچاس پیسے ::

طلسماتِ قرآنی

از مولوی محمد ابراہیم صاحب [illegible]

حضرت مولوی صاحب کی ایسی مشہور و قابل قدر تصنیف ہے جو زندگی کی ہر مشکل میں آپ کی مدد کرے گی۔ فاضل مصنّف نے قرآن کریم کی سُورتوں کے خواص و عملیات مُستند طور پر درج فرمائے ہیں۔ اِس کتاب کا مُطالعہ ہر مُسلمان کیلئے بیحد مُفید و موجبِ ثواب ہے۔ آج ہی طلب فرما کر دینی و دُنیوی فائدے حاصل کریں۔ کتابت و طباعت خوشخط و معیاری، کاغذ میکانیکل گلیز سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۱۸۴ صفحات، سرورق دو رنگہ انتہائی خوبصورت، ہدیہ دو روپے پچیس پیسے

رہنمائے دین مُفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

حدائقِ بخشش

اعلیحضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کا نعتیہ دیوان جس کا ہر ہر لفظ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ایک محبت بھرے عاشقِ رسولؐ کے دل کی پکار ایک عظیم انسان کا نذرانۂ عقیدت، وہ نعتیں جو آپکے دل کو محبتِ رسولؐ سے بھر دیں گی ہم نے جلی کتابت و خوبصورت طباعت سے شائع کیا ہے۔ چہار رنگہ خوبصورت سرورق نے خوبصورتی میں مزید چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سائز ۲۷ × ۱۷ / ۸ ضخامت ۲۲۰ صفحات ؛

قیمت:۔ مجلد قسم اوّل تین روپے ؛ قسم دوم مجلد دو روپیہ پچیس پیسے (علاوہ محصول ڈاک)

حیات المسلمین

حضرت حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی اس بےنظیر تصنیف میں نوّے آیاتِ قرآنی اور تین سو چالیس سے زائد احادیث جن سے رہِ حیات کے موڑ پر رہنمائی حاصل ہوتی ہے جمع فرما دی ہیں تاکہ لوگوں کو آسانی سے معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں کی زندگی کسطرح گذرنی چاہیئے ہر مسلمان کیلئے اسکا مطالعہ بیحد ضروری ہے تاکہ اسکی رہنمائی سے اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکے۔ کاغذ عمدہ گلیز۔ کتابت و طباعت انتہائی خوشخط و دیدہ زیب، سائز ۳۰ × ۲۰ / ۱۶ ضخامت ۳۰۴ صفحات، دو رنگہ حسین سرورق، قیمت:۔ تین روپے ؛ ؛

خطباتُ الاحکام مترجم

حضرت حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے نماز جمعہ و عیدین کے خطبے جو عربی میں ہوتے ہیں ان کا عام فہم و سلیس اردو ترجمہ مرتب کر دیا ہے تاکہ ہر مسلمان ان خطبوں کا مطلب سمجھ سکے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کا عالم، مولوی مفتی و ہر مسلمان سب کے پاس اس کا ہونا ضروری ہے ؛

کاغذ عمدہ گلیز۔ کتابت و طباعت انتہائی خوبصورت و دیدہ زیب۔ سرورق حسین سائز ۲۶ × ۲۰ / ۸ ضخامت:۔ ۱۹۶ صفحات ؛ قیمت:۔ دو روپے پچاس پیسے ؛

داستانِ یوسفؑ

تصنیف:۔ مولوی محمد اسحٰق دہلوی

وہ داستان جس کو قرآن کریم میں اللہ پاک نے بیان فرمایا، وہ حقیقت جو ایک صالح انسان اور مردِ مومن کا کردار پیش کرتی ہے ایسی دلچسپ کہ پوری کتاب پڑھے بغیر چھوڑنے کو دل نہ چاہے فحش ناولوں اور رومانی داستانوں کے اس دور میں سب سے زیادہ دلچسپ اور پاک و صاف زبان میں تحریر کی ہوئی حضرت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی تصنیف جو ہر مسلمان کیلئے قابلِ مطالعہ ہے۔ کتابت و طباعت خوشخط و دیدہ زیب، سائز ۳۰ × ۲۰ / ۱۶ ضخامت ۴۰۰ صفحات، ٹائٹل دو رنگہ قیمت:۔ چار روپے ؛

رہنمائے دین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ

مومن نمبر

(مرتبہ:- نیاز فتحپوری)

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو **شیخِ حرم** بھی ہے اور **رند شاھد باز** بھی، اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہلِ ذوق کیلئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اسکا صحیح اندازہ

"مومن نمبر"

کے مطالعہ سے ہوگا،

اس نمبر میں مومن کی سوانح۔ حیاتِ معاشقہ۔ اس کی غزل گوئی۔ قصیدہ نگاری مثنویات و رباعیات اور خصوصیاتِ کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہوگیا ہے کہ اس نمبر کو نظرانداز کر کے **مومن** پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے ❖ قیمت :- چار روپے

مینیجر **نگارِ پاکستان** ✷ ۳۲ ✷ گارڈن مارکٹ ✷ کراچی ۳

گردشِ مدام

روپیہ گردش میں رہتا ہے ۔ روپیہ کو گردش میں رہنا چاہیے ۔
سوال صرف اتنا ہے کہ جب یہ دست بدست آپ تک پہنچا
تو آپ نے اسے کس طرح استعمال کیا ۔
سیونگ اکاؤنٹ سے روپیہ کی صحت مند گردش جاری رہتی ہے ۔
آج ہی سیونگ اکاؤنٹ کھول کر اپنے بچوں کے لئے ایک
قابلِ تقلید مثال قائم کیجیے کہ
بچت آپ کے اور ان کے مستقبل کی ضامن ہے ۔
صرف پانچ روپیہ سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے ۔

دی مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس کراچی — ایس مصطفےٰ اسمٰعیل جنرل منیجر

MCB-52